فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	حج بیت اللہ	عظمیٰ پروین	10
قولِ نبیؐ	تزکیہ کرنے والے نبیؐ	ڈاکٹر آسیہ شبیر	11
خاص مضمون	مسجد اقصیٰ کی کہانی	ظفر بنگش	16
گزرا ہوا زمانہ	منبرِ مصطفیٰ	دانش یار	22
نوائے شوق	نعت	شہود ہاشمی	24
	غزل	کرامت بخاری	24
	غزل	نجمہ یاسمین یوسف	25
	مجھے مستور رہنے دو	روبینہ ناز	25
	دعائے دل	شمیم فاطمہ	26
	بقائے امن کے لئے	شمیم فاطمہ	26
حقیقت و افسانہ	تسبیح فاطمہ	افشاں نوید	31
	تجربہ	قانتہ رابعہ	34
	در دِلا دوا	ڈاکٹر شگفتہ نقوی	37
سلسلہ وار کہانی	شجرِ بے ثمر	نصرت یوسف	46
مطالعہ گاہ	میری لائبریری سے	ڈاکٹر نزہت اکرام	51
زندگی کا فن	بے معنی تفکرات سے بچیے	حمیرا خالد	70
منتخب کالم	نجات کا ذریعہ اجتماعی توبہ	مفتی محمد رفیع عثمانی	78

ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام!

چودہ اگست یوم آزادی پر لاہور سے نکلنے والے قافلے اسلام آباد میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ دھوپ، گرمی، بارش، آندھی، ہر طرح کے موسم میں کھلے آسمان تلے رہتے ان کو نصف ماہ سے زیادہ ہو چلا، مگر یہ لوگ اپنے مطالبات منوائے بغیر ٹلنے والے نہیں لگتے۔ علامہ طاہر القادری کا تو بنیادی مطالبہ مقتولین کی ایف آئی آر درج کروانے پر مبنی رہا۔ مگر عمران خان صاحب کا مطالبہ یہ ہے کہ اس ملک میں حقیقی جمہوریت آنی چاہیے۔

پاکستان میں انتخابی اصلاحات حقیقی جمہوری قوتوں کا ایک دیرینہ مطالبہ ہے، جس کی بازگشت ہر بار الیکشن کے موقع پر سننے میں آتی ہے، مگر جس کے پورا ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ آزاد الیکشن کمشن کے بغیر انتخابات کروانا جمہوریت کے ساتھ مذاق کے علاوہ کچھ نہیں۔ اسی طرح متناسب نمائندگی وہ نظام ہے جو ہر بار اسمبلیوں میں پہنچ جانے والے قبضہ گروپوں، مافیاؤں اور کرپٹ عناصر کا راستہ روک سکتا ہے اور عوامی رائے کی بہتر آئینہ داری کرتا ہے۔ ووٹنگ کے طریقِ کار کو جدید خطوط پر استوار کرنا بھی انتخابات کی شفافیت اور ٹرن آؤٹ بہتر بنانے کی طرف اہم قدم ہوگا۔ مگر گزشتہ انتخابات میں دھاندلی کی تحقیقات کروانا عمران خان صاحب کی احتجاجی تحریک کا مرکز ومحور تھا۔ انہوں نے میاں نواز شریف کی حکومت کو دھاندلی کا نتیجہ قرار دینے کے باوجود مئی ۲۰۱۳ کے انتخابات کے نتائج کو تسلیم کیا تاکہ جمہوریت چلتی رہے، مگر دھاندلی کی تحقیقات کا مطالبہ برابر جاری رکھا اور وہ اسی پر جمے رہے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ ان کا مطمحِ نظر حکومت حاصل کرنا ہے یا نہیں، اس تحریک کے نتیجے میں اگر واقعی پاکستان میں شفاف انتخابات کا نظام آجائے اور عوامی رائے کے مطابق حکومتیں بننے لگیں تو وہ عوام کو جوابدہ بھی ہوں گی اور یہی اصل جمہوریت ہے۔ ہمارا بنیادی مسئلہ بری طرزِ حکمرانی ہے جس کو درست کرنے کی کوشش کی جائے تو جمہوری نظام کو خطرے کا ڈراوا دے دیا جاتا ہے۔ پھر اسی بہانے سے لٹیروں کے گروہ باہم ملی بھگت سے اقتدار کی باریاں لیتے رہتے ہیں، اور عوام کی قسمت نہیں بدلتی۔ یوں جمہوریت کا نظام جس کی اصل روح عوامی احتساب ہے محض فرعونوں کو مسلط کرنے اور پھر انہیں برداشت کرنے تک محدود ہو جاتا ہے۔ پھر بات یہیں تک نہیں رہتی، بلکہ یہی لوگ جو عوام کے حقیقی نمائندے نہیں ہوتے اور نہ عوام کے پاس ان کی جوابدہی کا کوئی طریقہ باقی رہ جاتا ہے، وہ ملک کی خارجہ پالیسی کو بھی عوامی امنگوں کے مطابق بنانے کے پابند نہیں رہتے اور بین الاقوامی معاملات میں ملکی مفادات کا خیال نہیں رکھتے۔

بدقسمتی سے وطنِ عزیز گزشتہ کئی برسوں سے ان حالات کے شکنجے میں پھنسا ہوا ہے۔ یوں لگنے لگا تھا جیسے ہم بدقسمتی کے اس چکر سے کبھی نہ نکل پائیں گے۔ نہ پارلیمنٹ کے پاس عوامی شکایات کا کوئی حل نہ عدالتوں میں شنوائی۔۔۔ ڈیڈ لاک کا لفظ موجودہ صورتحال میں تو بے شمار بار بولا گیا، مگر اصل ڈیڈ لاک ان نام نہاد جمہوری گروہوں نے پیدا کر رکھا تھا جس میں قوم پھنس کر رہ گئی تھی۔

اس ماحول میں آزادی مارچ اور انقلاب مارچ کی للکاروں نے ملکی فضا میں ایک زبردست ارتعاش پیدا کیا۔ ملکی نازک صورتحال اور حالیہ عالمی حالات کے تناظر میں احتجاجی ریلیوں اور دھرنوں کا ایڈونچرازم کسی طرح بھی مناسب معلوم نہ ہوتا تھا۔ یہ ہر لحاظ سے ایک ہائی رسک والا اقدام تھا، عوام کے لیے بھی اور ان احتجاجی گروہوں کے لیے بھی۔ ہر گھڑی ایک خوف تھا، ان ہونی کا، سازش کا، دنگے فساد کی آگ بھڑک اٹھنے کا، اور اس بہانے ایک بار پھر غیر جمہوری قوتوں کے تسلط کا۔ خصوصاً علامہ صاحب کے مطالبے کا قانونی واخلاقی جواز موجود ہونے کے باوجود ان کے بارے میں بیشمار تحفظات پائے جاتے تھے۔ ڈی چوک میں ہونے والے ان کے گزشتہ شو کی وجہ سے ان کے حالیہ

ایجنڈے کے بارے میں بے حد خدشات موجود تھے۔ان کا کینیڈین پس منظر بھی ایک عام پاکستانی کے نزدیک ان کو ایک قومی لیڈر قرار دینے میں مانع ہے، گویا

اب تک نہ کھل سکا کہ مرے روبرو ہے کون
کس سے مکالمہ ہے پسِ گفتگو ہے کون

مگر اس بار ان کا کیس بھی مضبوط تھا اور انداز بھی قدرے منجھا ہوا تھا۔ اگر چہ ان کی طاقت انتخابی حلقوں کے بجائے ان کے اپنے اداروں کے مخصوص عقیدت مندوں میں مضمر ہے۔ دوسری طرف تحریکِ انصاف ہے جس کے ساتھ تبدیلی کا خواب لیے ایسے لوگ ہیں جو اس سے پہلے شاید کبھی سیاست میں دلچسپی نہ رکھتے تھے، اور جس کی انتخابی کارکردگی اس بار دھاندلی کے باوجود قابلِ رشک رہی۔ میاں نواز شریف کی تاریخ حقائق سے صرفِ نظر کی رہی ہے اور اس بار بھی انہوں نے یہی ثابت کیا، اور انہیں یہ دن دیکھنا پڑا۔

الطاف حسین جن کی جماعت نے کراچی میں خود دھاندلی تو کیا، کھلی غنڈہ گردی کر کے اپنے لوگوں کو جتوایا، کوئی واضح موقف دینے سے قاصر رہے۔ کراچی میں ہونے والی غنڈہ گردی کا جماعتِ اسلامی نے سب سے زیادہ سامنا کیا اور نقصان اٹھایا، اور یہ بات قابلِ تحسین ہے کہ سراج الحق صاحب نے عمران خان کے موقف کی اصولی حمایت کے باوجود اس بحران میں غیر جانبدار ثالث کا کردار ادا کیا جس کو ان کے مخالفین نے بھی سراہا ہے۔ البتہ مولانا فضل الرحمان کا پورا وزن حکومتی پلڑے میں رہا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دونوں احتجاجی رہنما اپنے اپنے اگلے لائحۂ عمل کا کیا اعلان کرتے ہیں۔ دعا ہے کہ ان کی جدوجہد کے نتیجے میں ملک میں مثبت تبدیلی آئے اور واقعی عوام کو خوشخبری ملے۔ آمین

امجد اسلام امجد کے ان اشعار کے ساتھ اجازت دیجیے ع

جو زندگی فروش تھے — وہی ہیں شہر کی زباں
جو خود زمیں کا بوجھ ہیں — بنے ہیں میرِ کارواں
غلام سر اٹھائیں گے — کہاں تھا تخت کو گماں
زمین کھا گئی انہیں — جو بن رہے تھے آسماں
جو زندگی کا حسن تھے — وہ لوگ رہ گئے کہاں
بہت تلاش ہو چکی — بس اب تو تھک گئے میاں
بنیں گی ابر ایک دن — یہ چھوٹی چھوٹی بدلیاں

دعا گو

صائمہ اسما

جو مسلمان فریضۂ حج ادا کرتا ہے وہ اللہ کے لیے گھر بار، بیوی بچے، کاروبار، دوست اور وطن کو ایک مدت کے لیے خیر باد کہتا ہے، یہیں سے اُسے راہِ خدا میں تکلیفیں اٹھانے، اپنے مال اور اپنی راحت کو خدا کی خوشنودی پر قربان کر دینے کی تربیت ملتی ہے۔ جب ایک مسلمان حج کی نیت کرتا ہے تو اُسے اپنے عزیزوں، دوستوں، معاملہ داروں اور ہر طرح کے متعلقین سے اپنے معاملات صاف کرنے کی فکر ہونے لگتی ہے۔ بدکلامی، بے حیائی، بددیانتی، جھگڑا فساد سے خود اُس کی طبیعت اندر سے رکتی ہے کیونکہ وہ خدا کے راستے میں جارہا ہے۔

مناسکِ حج کی غرض و غایت یہی ہے کہ انسان اللہ کے قریب ہو جائے اور اُس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے۔ اس طرح وہ اللہ

عظمیٰ پروین

حج بیت اللہ

تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فرائض سرانجام دینے کے لیے تیار ہو جائے۔ حج کے دوران انسان تمام دنیاوی معاملات ترک کر دیتا ہے۔ اپنے عادی لباس سے بھی علیحدہ ہو کر نہایت سادہ اور فقیرانہ لباس پہن لیتا ہے۔ اس سے انسان کے باطن کی بھی خوب اصلاح ہوتی ہے، کبر و غرور نکلتا ہے، مسکینی اور امن پسندی پیدا ہوتی ہے اور خدا پرستی کی کیفیت انسان کے ظاہر و باطن پر چھا جاتی ہے۔ یہ پورا عرصہ تعلق باللہ کے قیام کی روحانی مشقوں کا عرصہ ہوتا ہے۔ یہاں ذکر و تلبیحات میں مشغولیت کے باعث انسان کے دل و دماغ اور سماعت و بصارت سب پر اللہ کی الوہیت، ربوبیت اور شانِ کبریائی کا نقش ثبت ہوتا ہے۔ حج کے دوران متواتر اللہ کی یاد اور اطاعت وفرمانبرداری میں اپنا وقت گزارنے کے باعث انسان نیکیوں کا عادی ہو جاتا ہے اور اس کی طبیعت گناہوں اور برائیوں سے متنفر ہو جاتی ہے اسی لیے نبیؐ نے فرمایا: ''حج مبرور کا ثواب جنت کے سوا کچھ نہیں۔'' (بخاری و مسلم)

حج کا زمانہ تمام روئے زمین میں اسلام کی زندگی اور بیداری کا زمانہ ہے جب ایک مسلمان حج کی نیت کرتا ہے تو اس پر خوفِ خدا، پرہیزگاری، توبہ، استغفار اور نیک اخلاقی کے اثرات چھانے لگتے ہیں۔ ایک حاجی کی اس حالت سے کتنے لوگوں پر اثر پڑتا ہوگا۔ حاجیوں کے قافلے جہاں جہاں سے گزرتے ہیں اُنھیں دیکھ کر، اُن سے مل کر، اُن کی لبیک لبیک کی آوازیں سن کر کتنوں کی توجہ اللہ کی طرف اور اس کے گھر کی طرف پھر جاتی ہوگی۔ پھر جب حاجی حج کی کیفیتوں کا خمار لیے اپنی اپنی بستیوں کی طرف پلٹتے ہیں تو اُن سے معاملات کر کے اور اُن کی زبانِ حال اور زبانِ قال سے اللہ کے گھر کا ذکر سن کر کتنے بے شمار حلقوں میں دینی جذبات تازہ ہو جاتے ہوں گے۔

حاجیوں کی زبانیں، رنگ اور شکلیں مختلف ہونے کے باوجود سب کے سب ایک ہی سادہ طرز کا یونیفارم پہن کر ایک ہی مرکز کے گرد گھومتے ہیں جو اس بات کا مظاہرہ ہے کہ تمام لوگ ایک ہی امت کے افراد ہیں، بالکل برابر جس طرح کنگھی کے دندانے، کسی کو کسی پر برتری نہیں صرف تقویٰ اور خدا خوفی ہی فضیلت کا معیار ہے۔ حاجیوں کے مقدس قافلے یک زبان ہو کر لبیک لبیک کے نعرے بلند کرتے ہوئے چلتے ہیں یہ کلمہ سب کو توحید کی لڑی میں پرو کر ایک تنظیم بنا دیتا ہے۔ صبح و شام یہی آوازیں گونجتی ہیں تو آدمی اس کے نشے میں سرشار ہو کر اپنی خودی کو بھول جاتا ہے۔ ''اسلامی رنگ میں رنگ جاؤ اور اللہ سے مغفرت طلب کرو'' یہی ہر حاجی کے دل کی آواز ہے۔

دنیا میں امن قائم کرنے، قوموں کی دشمنیوں کو مٹانے اور لڑائی جھگڑوں کی بجائے محبت، دوستی اور برابری کی فضا پیدا کرنے کے لیے اس سے بہتر نسخہ کوئی نہیں۔ سپاہیانہ زندگی جو اسلامی زندگی کا خصوصی شعار ہے حج کے سفر میں پورے طور پر پائی جاتی ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: ''سب سے افضل جہاد وہ حج ہے جس کے دوران گناہ نہ کیا جائے۔''

علمی حیثیت سے سفرِ حج نہایت مفید ہے۔ اس موقع پر مختلف نوع کے علماء سے افادہ اور استفادہ ممکن ہوتا ہے۔ ہمارے اسلاف اس ضمن میں حج سے بہت فیض یاب ہوئے۔ حج کی بدولت آن کی آن میں سندھ کا علم اسپین میں اور اسپین کی تحقیق سندھ میں پہنچ جاتی ہے۔

حج دراصل اسلامی نظریۂ حیات کے آثارِ قدیمہ کی زیارت بھی ہے۔ جن برگزیدہ ہستیوں کی ذات اس سے وابستہ ہے ان کی روحیں حاجی کو یہاں گھومتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان آیاتِ بینات اور آثارِ متبرکہ کو دیکھ کر ایک خدا پرست آدمی عزم و ہمت اور جہاد فی سبیل اللہ کا جو سبق لے سکتا

ہے شاید کسی دوسری چیز سے نہیں لے سکتا۔ حضرت ابراہیمؑ کا تصور پردۂ خیال پر نمودار ہوتا ہے وہ اپنے شیر خوار بچے اور اُن کی والدہ کو حکم الٰہی کے مطابق اس وادئ غیر ذی زرع میں چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی اشارۂ خداوندی پر اپنے جگر گوشے کو ذبح کرتے نظر آتے ہیں اور کبھی اُسی فرزند حلیم کے ہمراہ خانۂ خدا کی دیواریں اٹھاتے دکھائی دیتے ہیں۔

کبھی پردۂ تخیل میں فخر موجودات ابھرتے ہیں جن کی ساری زندگی مکہ اور مدینہ میں گزری۔ حج کے دوران دونوں شہروں کی زیارت سے نبیؐ کے ہر زمانہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ یہ آپؐ سے محبت وتعلق کو بڑھانے کا بڑا مضبوط ذریعہ ہے۔

۹ ذوالحجہ کو میدانِ عرفات میں حاضری ہوتی ہے۔ یہی اصل حج ہے۔ یہاں کوسوں تک جہاں جہاں نظر کام کرتی ہے ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہوکر رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اپنے خدا سے تسلیم واطاعت کا نیا عہد باندھتے ہیں۔ ہر شخص کو دائیں بائیں، آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے تو وہ خود اس ماحول میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہتی ہے۔ وقوفِ عرفات میں ایک طرف تو اسلام کی شان وشوکت کی عظیم الشان نمایش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماعِ عظیم روزِ حشر کی یاد دلاتا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: ''عرفہ سے زیادہ کسی اور دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جہنم سے آزاد نہیں کرتا اور وہ اُس دن (اپنے بندوں سے) قریب ہوتا ہے اور اُن کے ذریعے فرشتوں پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے یہ بندے کیا چاہتے ہیں۔'' (مسلم)

حج اسلام کا صرف مذہبی رکن ہی نہیں بلکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو کے لحاظ سے خیر وبرکات کا حامل ہے اور مسلمانوں کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے۔

<u>ہماری محرومیاں</u>: آج امت مسلمہ خدا سے غفلت اور دین بے زاری کے باعث حج کے ان فیوض وبرکات سے محروم ہوچکی ہے جو لوگ نہ عبادت کے معنی ومفہوم کو سمجھیں، نہ اس کے فوائد کو حاصل کرنے کا ارادہ ہی کریں وہ اس عبادت سے فیض یاب کس طرح ہوسکتے ہیں۔ اگر مرکز اسلام میں خالص اسلامی زندگی کا ایک مکمل نمونہ موجود ہوتا تو ہر سال دنیا کے مسلمان وہاں سے صحیح دینداری کا تازہ سبق لے کر پلٹتے وہاں ہر طرف دنیا پرستی، بداخلاقی اور طمع ولالچ دیکھ کر بہت سے لوگ ایمان بڑھانے کی بجائے اور الٹا کچھ کھوآتے ہیں۔ افسوس کہ امت مسلمہ کی جہالت کے باعث کتنی بیش قیمت چیز کس بری طرح ضائع ہورہی ہے۔

استفادہ: ''فی ظلال القرآن'' سید قطب شہید، ''خطبات''، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ''صیامِ رمضان وحج بیت اللہ'' بنت الاسلام، ''فضائل صدقات وحج''۔

☆......☆......☆

تدریسی مہارتوں کا استعمال:

جدید تدریسی طریقوں میں Audio Visual Aids کے استعمال پر بہت زور دیا جارہا ہے اور دور جدید نے اس کی اہمیت کو بجا سمجھا ہے۔ یہ طریقِ تدریس، اس روایتی طریقے کی نسبت واقعی زیادہ قابل فہم، جاذب توجہ اور موثر ہے، جہاں صرف لیکچر اور یک طرفہ گفتگو ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایسی مددگار ٹیکنالوجی، گو نہیں تھی، لیکن آپ نے اپنے گرد وپیش کے ماحول اور اپنے ہاتھوں اور تاثرات سے اس معاملے میں بھرپور مدد لی۔ حدیث اور سیرت کے ابواب اس کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔

قولِ نبی

آخری حصہ

تزکیہ کرنے والے نبی ﷺ

ڈاکٹر آسیہ شبیر

نبی کریمؐ کبھی ہاتھوں کے اشاروں سے کام لیتے تھے۔ مثلاً دو بیٹیوں کی پرورش کرنے والے کو اپنی معیت کی نوید، ہاتھ کی دو انگلیاں جوڑ کر سنائی۔ (مسلم شریف) قرب کا یہ ''محسوس،، منظر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی آپؐ اپنے ماحول کی مانوس اشیاء سے نتیجہ خیز قسم کے سوالات اٹھاتے۔ مثلاً یہ راستے میں پڑا مردہ بکری کا بچہ کون لے گا؟ پھر بتایا کہ دنیا کی حیثیت اللہ کے نزدیک ایسی ہی ہے۔ (الترمذی) آپؐ قابل فہم اور آسان مثالیں بھی دیتے، اپنے مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق۔ مثلاً یہ کہ پانچ وقت نہر میں نہانے سے جسمانی میل کچیل صاف ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی پانچ نمازوں سے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ (بخاری شریف) کبھی آپؐ اپنی body language سے بڑا ابھرپور پیغام دیتے۔ مثلاً سائل کے پوچھنے پر کہ مومن بخیل ہو سکتا ہے، بزدل ہو سکتا ہے، آپؐ نے تائید فرمائی، لیکن جھوٹ بولنے کے ذکر پر آپؐ ٹیک سے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور سخت لہجے میں تین مرتبہ فرمایا کہ مومن جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ (مؤطا امام مالک)

عرب کے عام ماحول میں کھلا پن بہت زیادہ تھا۔ ایک نوجوان آپؐ کے پاس آیا اور بدکاری کی اجازت طلب کی۔ صحابہ غصے میں اسے مارنا چاہتے تھے لیکن آپؐ نے انہیں روکا اور خود اس نوجوان سے سوالات کے ذریعے کہلوا لیا کہ وہ یہ کام اپنی ماں، بہن، خالہ اور پھوپھی کے لیے پسند نہیں کرتا۔ پھر اسے دعا دی۔ (مجمع الزوائد) راوی کہتے ہیں، اس کے بعد اس نے ساری زندگی نظر بھی اِدھر اُدھر نہیں اٹھائی۔ کتنے مواقع تھے، آپؐ نے تمثیل کے ذریعے، کنایوں سے، اپنے چہرے کے تاثرات کے ذریعے معاملہ واضح فرما دیا۔ خطبے اور تقریر میں الفاظ کے چناؤ اور زیر و بم سے آپ سامعین میں مطلوبہ کیفیت پوری طرح ابھار لیتے تھے۔ کوہ صفا پر آپؐ کا اولین خطبہ اور حنین کے مال غنیمت پر انصار کے اعتراض کے بعد دیا جانے والا خطبہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ (طبقات ابن سعد)

سورۃ الانعام کی آیت ''وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا فَاتَّبِعُوۡهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمۡ عَنۡ سَبِيۡلِه'' (الانعام۔۱۵۳) یعنی ''یہی میرا سیدھا راستہ ہے اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس راستے سے ہٹا کر تم کو پراگندہ کر دیں گے۔'' اس آیت کا مطلب سمجھانے کے لیے آپؐ زمین پر تشریف فرما ہوئے۔ ایک خط کھینچا اور فرمایا: یہ اللہ کی راہ ہے۔ پھر اس کے دائیں اور بائیں جانب خطوط کھینچے اور فرمایا: یہ راہیں ہیں جدا جدا، ان میں سے ہر راہ پر شیطان بلا رہا ہے اور پھر آپؐ نے مندرجہ بالا آیت پڑھی۔ (مسند احمد) اس حدیث کی شرح میں علامہ طیبی لکھتے ہیں: ''مخفی معانی کو اجاگر کرنے اور پوشیدہ رموز کی نقاب کشائی کی غرض سے تصویر و تمثیل استعمال کی جاتی ہے تاکہ وہ مرئی اور محسوس چیزوں کی طرح آشکار ہو جائیں اور بات سمجھنے میں خیال، عقل کی مدد کرے۔ (شرح مشکوٰۃ)

ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مربع شکل بنائی۔ اس کے درمیان ایک خط کھینچا، جو اس سے باہر نکلا ہوا تھا۔ پھر اس مربع کے درمیانی خط کی طرف چھوٹے چھوٹے خطوط کھینچے اور فرمایا: ''یہ انسان ہے، یہ اس کی موت اس کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ باہر نکلا ہوا خط اس کی آرزو ہے۔ یہ چھوٹے خطوط مصائب ہیں۔ پس اگر وہ ایک سے بچ نکلتا ہے تو دوسری میں پھنس جاتا ہے اور دوسری سے نکلتا ہے تو تیسری میں گرفتار ہو جاتا ہے۔'' (ابن ماجہ)

مضبوط علمی شخصیت / رسوخ فی العلم:

استاد کا علمی رسوخ جہاں خود اسے اعتماد عطا کرتا ہے، وہاں طلبہ کے اندر اس کا احترام اور اس کی معلومات پر اعتبار پیدا کرتا ہے۔ جدید تحقیقات یہی رہنمائی دیتی ہیں کہ استاد کو اپنے مضمون سے گہری وابستگی ہونی چاہیے۔ اس کے ذہن میں شامل نصاب مواد واضح ہو۔ وہ اس کے پہنچانے اور سمجھانے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس مضمون کے دیگر نصابات کے بارے میں بھی اطلاع رکھتا ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں دیکھا جائے تو ان پر جو "تشریعی" ذمہ داری ڈالی گئی، اس کا تقاضا تھا کہ اس میدان کے subject matter پر ان کی مکمل گرفت ہو۔ اس منصب کے حوالے سے اللہ تعالی نے فرمایا:

وَ عَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا (النساء:۱۱۳) آپ کو وہ علم عطا کیا جو آپ پہلے نہ جانتے تھے۔ ظاہر ہے بعثت سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ کچھ نہ جانتے تھے۔

مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (الشوریٰ:۵۲) یعنی "تمھیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے مگر اُس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔"

تعلیم کتاب و حکمت، تبیین و تعیین احکام و شرائع اور تزکیہ نفوس کے فرائض کی ادائیگی کے لیے اس عطائے ربانی کے ساتھ، آپؐ نے اپنی صلاحیتوں کو بھی بھرپور استعمال فرمایا۔ اپنی ذہنی، قلبی اور علمی سرگرمیوں کا رخ اس طرف سے ہٹنے ہی نہیں دیا۔ اہل کتاب کو یہ حکم دیا گیا تھا۔ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ (الزمر) یعنی "تم اس چیز کے بہترین پہلو کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کی گئی ہے۔" لیکن وہ یہ نہ کر سکے۔ قانون کو جامد کیا اور اس کے "احسن"، کی جگہ ظواہر کو لے لیا۔ نبی کریمؐ نے جمود کی بجائے، دائرہ قانون میں رہتے ہوئے ضروری لچک اور رعایت کو اختیار فرمایا۔ شخصی حالات، نفسی کیفیات، گرد و پیش کے احوال اور معاملات کی خاص نوعیت کو ملحوظ رکھنے کی وجہ سے آپ کے فیصلوں میں وہ تنوع ملتا ہے جس نے بعد کے ادوار میں امت مسلمہ کو حدود شریعت کی پاس داری کے ساتھ، گنجائش اور وسعت اختیار کرنے کی صلاحیت عطا کی۔ پیروانِ حضرت موسیٰ علیہ السلام جمود کا شکار ہوئے تھے اور ان کے ردعمل میں مسیحیت نے پہلے شریعت کا جوا کندھے سے اتار پھینکا اور بعد ازاں احیائے علوم (reniassance) کے دور میں مذہب کو زندگی کے ہر میدان سے خارج کر دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایسی مثالیں بے شمار ہیں۔ حضرت حاطب بدریؓ کو آپ نے ایک نازک موقع پر اسلامی ریاست کی مخبری کے باوجود معاف فرمایا۔ (مسلم شریف) ایک صحابی کو، جو روزہ توڑنے کا کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے، بالآخر ہنستے ہوئے صدقہ کی کھجوروں کا ٹوکرا گھر لے جانے کا اذن عطا فرمایا۔ (مسلم شریف)

اس طرزِ عمل سے آپؐ نے اپنے اصحاب میں اس تصور کو بھی مستحکم کیا جس کا ذکر حضرت ابوالدرداءؓ نے یوں کیا ہے کہ فقیہ وہ ہے جو ایک آیت سے ایک سے زیادہ مواقع پر استدلال کر سکتا ہو۔ (الفوز الکبیر) صحابہ کرام کی تربیت میں آپؐ نے یہ ضوابط اس انداز میں شامل فرمائے کہ وہ آپؐ کے بعد عالمِ انسانی کی رہنمائی کے قابل ہوئے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کے اجتہاد کے ارادے پر آپؐ نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ (ابوداؤد) یمن میں حضرت علیؓ نے جو فیصلے کیے، ان کی تائید فرمائی۔ (موسوعہ فقہ علی) اپنے صحابہ کے تیمم کے معاملے میں دو مختلف طرزِ عمل اختیار کرنے پر دونوں کی توثیق فرمائی۔ (ابوداؤد) اور یوں معلمِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک کے لیے وہ گنجائش پیدا کر دی کہ فروعی اور جزوی آراء میں اختلاف کے باوجود، علمی ترقی اور معاشرتی وحدت کا سفر رکا نہیں۔

واضح مقاصد اور بلند اہداف:

وہ انسانی مواد، جو عرب کے ریگ زاروں اور کم متمدن شہروں میں بکھرا پڑا تھا، اور جس نے تاریخ میں کبھی کوئی بڑا کارنامہ نہیں دکھایا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منظّم کیا، کلمے کی بنیاد پر ایک قوم بنایا اور تعلیم، تربیت اور تزکیے کے عمل سے گزارا۔ اس کے بعد انہیں واضح، بلند اور آفاقی مقاصد اور نصب العین کے حصول کے لیے میدانِ عمل میں اتار دیا۔ دورِ جدید کی تحقیق بالکل بجا رہنمائی کر رہی ہے کہ اچھا استاد وہ ہے جو اپنے زیرِ تربیت افراد کو clear objectives and high expectations دے سکے۔ نبی مہربانؐ کے اسوہ تعلیمی سے بڑھ کر اس کی کامیابی کا سراغ کہیں اور نہیں ملتا۔

رسالت کا منصبِ جلیل اور بلند اہداف، ایک دوسرے سے کلی مطابقت رکھتے ہیں۔ ابتدائی دورِ دعوت میں جب قریش نے ابوطالب پر زور دیا کہ وہ اپنے بھتیجے کو روکیں یا اس کی حمایت سے دستکش ہو جائیں۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اگر یہ میرے دائیں ہاتھ سورج اور بائیں ہاتھ چاند بھی رکھ دیں، میں یہ کام نہیں چھوڑوں گا۔ ''حتـــی یـظهــره الله او اهــلک'' (ابن ہشام) یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اپنی دعوت پہنچا دینے کی نہیں، اس کے غلبے کے لیے جان لڑا دینے کی بات کی ہے۔ انسانی عزم و حوصلے کی یہ آخری منزل ہے۔

مکہ ہی میں جب کمزور مسلمان، اہلِ مکہ کے ظلم و ستم اور تعذیب کا سامنا کر رہے تھے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی پوری طرح مامون نہیں تھے، حضرت خبابؓ نے تکالیف کی شکایت اور اللہ کے حضور دعا کی استدعا کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کی نصیحت کے ساتھ یہ بھی بشارت دے دی کہ ''ایک سوار صنعا سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہوگا۔،، (بخاری شریف) یہ اسلام کے سائے میں یمن تک کی سلطنت اور اس کے مثالی امن و امان کا وعدہ تھا۔ اس حال میں، کہ ظاہری حالات میں کسی کامیابی کا امکان کہیں دور تک بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

سفرِ ہجرت میں، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھی کے ساتھ چھپ چھپا کر سفر کر رہے تھے، اور دونوں شدید خطرے میں تھے، آپؐ نے سراقہ کو امان نامہ بھی دیا (بخاری شریف) (گویا آپؐ ہی عرب کے آئندہ حکمران ہیں۔) اور کسریٰ کے کنگنوں کی بشارت بھی۔ جو بعد میں حضرت عمرؓ نے فتح ایران کے بعد انہیں پہنائے۔ (فقہ عمرؓ)

غزوہ احزاب میں مدینے میں مسلمانوں کی خوف اور پریشانی میں جو حالت تھی، قرآن پاک نے اس کا بلیغ نقشہ کھینچا ہے

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (الاحزاب ۱۰،۱۱)

''جب دشمن اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے۔ جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں۔ کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے۔''

اس جنگ میں مٹھی بھر مسلمانوں نے عرب قبائل کی اتحادی فوج کا سامنا کرنے میں بے مثال عزم و ہمت کا ثبوت دیا۔ شدید جسمانی مشقت بھی اٹھائی، بقول نعیم صدیقی: "تین ہزار مسلم رضا کاروں نے تین لاکھ آٹھ ہزار مکعب گز مٹی کو کھودا اور منتقل کیا۔ (محسن انسانیت) اس دوران ایک سخت چٹان جو صحابہ کرام سے نہیں ٹوٹ رہی تھی، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر لے گئے۔ آپؐ نے بسم اللہ کہہ کر پہلی ضرب لگائی، چنگاریاں اڑیں تو فرمایا: یمن میرے لیے فتح ہوا۔ دوسری ضرب پر فرمایا: شام اور المغرب (روم) میرے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ اور تیسری فیصلہ کن ضرب پر فرمایا: خطّہ مشرق (یعنی ایران) میرے سامنے مفتوح ہوا۔ (الرحیق المختوم) یہ وہ دن تھے، جب منافقوں نے پھبتی کسی کہ یہاں بیت الخلا جانا ممکن نہیں ہو رہا اور یہ "صاحبؐ" روم و ایران کی فتوحات کی پیش گوئی فرما رہے ہیں۔ (محسنِ انسانیت) تاریخ نے ثابت کیا کہ مسلمانوں کے عزم و حوصلے نے ان سلطنتوں کو زیر کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ مدینے کے آخری دور میں آپؐ نے جہاد میں بحری بیڑے کے استعمال کا اشارہ بھی دیا تھا۔ (الترمذی)

نبی کریمؐ کی امید کی یہ بلند پروازی کبھی معطل نہیں ہوئی۔ قیصر کو جو نامہ مبارک بھیجا، بروایت بخاری اس میں لکھا'' اسلم تسلم'' (مسلم شریف) وقت کی سپر پاور کو باور کروا دیا کہ امان اب اسلام کے دامن رحمت کے سوا کہیں اور نہیں ہوگی۔ آپؐ نے قوموں کے مفتوح ہو جانے اور مسلمانوں کی بالادستی اور بالآخر دین قبول کر لینے کی طرف بھی اشارہ کیا کہ میری امت کے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے جنت میں لائے جائیں گے۔ (تفسیر کبیر۔ابن تیمیہ)

یوں، خاتم النبیین اور معلم آخرین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قوم کو، جو محض تجارت کے لیے سال میں دو بیرونی سفر کرتے تھے (رحلة الشتاء والصیف) دنیا کی عظیم الشان سلطنتوں کی عنان اقتدار تھامنے کا حوصلہ اور عزم عطا فرمایا۔ اسلام لانے کے بعد عربوں کے احوال کے اس تغیر کو ایرانیوں نے محسوس کیا اور چیخ اٹھے کہ اونٹنی کا دودھ پینے اور گوہ کا گوشت کھانے والے عرب آج سلطنت اور جہاں بانی کا خواب کیسے دیکھنے لگے ہیں۔ (قرآن پاک کا مطالعہ از عبید اللہ سندھی) مسلمانوں نے نہ صرف دنیا کے وسیع علاقوں کو فتح کیا بلکہ ایک پائیدار اور مستقل تبدیلی کی بنیاد رکھی۔ انسانیت کو عادلانہ طرز حکمرانی سے روشناس کروایا اور انسانی مزاج میں وہ تبدیلی پیدا کر دی کہ ظلم، استحصال، استعمار اور دیگر جاہلی رواجوں کا اپنے حقیقی ناموں کے ساتھ سامنے آنا ناممکن ہو گیا۔ اب اصطلاحات اور لیبل بدل کر کام چلایا جاتا ہے لیکن ملمع بار بار اترتا ہی رہتا ہے۔

عصر حاضر اور مسلمان معلم کی ذمہ داریاں:

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے ورق الٹتے جائیں، ایک معلم کے لیے سبق ہی سبق ہیں۔ اخلاق میں، معاملات میں، تدریسی عمل میں اور پھر اعلیٰ ترین نتائج اور ثمرات کی صورت میں۔

دور جدید افادیت پرستی (utilitarianism) کا دور کہلاتا ہے۔ اس پیمانے پر بھی پرکھ لیجئے، مکتب نبوت کی product بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں منبر پر چڑھ کر خود کو ہی مخاطب کیا: کہ ایک وقت تھا، جب تم عمیر کہلاتے تھے، بکریاں چراتے تھے، سخت گیر باپ کی ڈانٹ کھاتے تھے، اور آج تم ایک عظیم سلطنت کے سربراہ ہو۔ (الفاروق شبلی نعمانی) اور یہ حقیقت کسی سے اوجھل نہیں کہ سلطنت کی محض وسعت آپ کا اعزاز نہ تھا، اصل اعزاز اس کا حسن انتظام اور استحکام تھا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ صفہ کے معلم تھے، یمن کے عامل بنے (خیر القرون کی درسگاہیں: از قاضی اطہر مبارک پوری)۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تنگنائے عرب سے نکلے اور اپنی حربی مہارت کا سکہ ایسا بٹھایا کہ دنیا کے صف اول کے جرنیلوں میں آپ کا نام نامی شامل ہے (عمر فاروق: محمد حسنین ہیکل)۔ کتنے ایسے تھے کہ حکمت جن کی زبان پر جاری ہو گئی۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مبارک دی ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو'' لیھنک العلم یا ابا المنذر'' (مسلم شریف)''، تمہیں علم مبارک ہو اے ابومنذر۔ اصحابؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدل، مروت واحسان، علم سے والہانہ محبت، تدریسی لگن اور مہارت کی مثالیں قائم کیں۔ دنیا نے ان کے علم سے فیض پایا اور دنیا و آخرت کے منافع انھیں کے واسطے سے حاصل کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اسوہ اور نمونہ تاریخ کے ہر دور میں اپنا اعتبار (Credibility) ثابت کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی کرے گا۔

معلم انسانیتؐ نے بلند ترین مقاصد کے لیے کام کرتے ہوئے وسائل کی کمی کو سد راہ نہیں ہونے دیا۔ اپنا خام مال (یعنی طلبہ علم) معاشرے کے ہر طبقے سے اکٹھا کیا اور اسے دنیا میں تبدیلی کے لیے استعمال فرمایا۔ آپؐ نے اپنی کامیابی کے لیے تعصب کے ہتھیار کو بھی استعمال نہیں کیا، جیسا کہ انقلابات دنیا کا دستور ہے...... مثلاً طبقاتی کشمکش، مرد و عورت کی کشمکش، غلاموں اور آقاؤں کی کشمکش وغیرہ، بلکہ مثبت طور پر معاشرے کے تمام طبقات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر کے، اور ان کی تعلیم کے ساتھ تزکیہ کے عمل کو جوڑ کر انہیں ہدف عطا فرمایا'' وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (الرعد) جو انسانیت کے لیے نفع رساں رہے گا، وہی زمین پر برقرار رہے گا۔

امت مسلمہ کے آج بھی وہی بحران ہیں۔ وسائل کی کمی، مسائل کی کثرت......اور اس پر مستزاد یہ بدنصیبی کہ جو طبقات دینی و دنیاوی علوم میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں، وہ بدعنوانی کے عادی اور دین دشمنوں کے آلہء کار بن جاتے ہیں۔ امت کی خواری اور زبوں حالی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علوم دینیہ کے ادارے ہوں یا علوم دنیا کے، فنون اور مہارتوں کو قرار واقعی مقام ضرور دیں، لیکن تزکیہ کا عمل مقدم ترین ہونا چاہیے۔ اس تزکیہ کی بدولت فن اور ہنر میں ترقی بھی ملے گی اور انسانی سرگرمیوں کے نتائج میں برکت بھی۔ یہی تعلیم کا حقیقی مقصود ہے اور حقیقی فلاح و کامرانی۔

☆......☆......☆

''پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے۔'' (بنی اسرائیل۔۱)

مسجد اقصیٰ کو اسلامی روایات اور اسلامی تاریخ میں بے انتہا اہمیت حاصل ہے۔ اسے مسلمانوں کا قبلۂ اول بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ابتدائی سالوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کر کے ہی نماز پڑھتے تھے۔ اسلام میں یہ مسجد الحرام اور مسجد نبوی کے بعد تیسری ایسی مسجد ہے جسے خاص تقدس حاصل ہے۔ یہ مسجد اس جگہ تعمیر کی گئی ہے جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے سفر پر روانہ ہونے

خاص مضمون

ظفر بنگش

مسجد اقصیٰ کی کہانی

سے پہلے نماز میں تمام انبیاء اکرام کی امامت کرائی تھی۔ یہ اس رات کا واقعہ ہے جب اللہ تعالیٰ آپ ؐ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گیا اور پھر وہاں سے معراج کا سفر شروع ہوا اور آپ ساتوں آسمان عبور کر کے ایک ایسے بلند مقام پر پہنچے جسے قرآن میں سدرۃ المنتہیٰ کہا گیا ہے۔

عہد حاضر کی تاریخ میں مسجد اقصیٰ کو ایک متنازع جگہ بنا دیا گیا ہے کیونکہ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ اس جگہ تعمیر کی گئی ہے جہاں اس سے پہلے یہودی عبادت گاہ بنائی گئی تھی جسے ''ہیکل'' کہا جاتا تھا۔ ان کے اس دعویٰ میں حقیقت کی بجائے زیادہ تر افسانوی باتیں شامل ہیں۔ یہ عبادت گاہ بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں کئی بار مسمار ہوئی۔ ۵۸۷ قبل مسیح میں بابل کے فرمانروا بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کیا اور اس عمارت کو مکمل طور پر مسمار کر دیا، اسرائیلیوں کو غلام بنا لیا گیا اور وہ ستر سال تک اس اذیت ناک حالت میں مبتلا رہے۔

یہ عبادت گاہ متعدد بار تعمیر کی گئی اور مسمار کی گئی۔ آخری بار ۷۰ عیسوی میں رومیوں نے اس کو تباہ کیا۔ اس کے بعد اس عمارت کا کوئی نشان تک باقی نہ رہا۔ اب کٹر صیہونی اس حرم شریف پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کے اندر عبادت کرنے کا حق بھی مانگ رہے ہیں، حالانکہ خود یہودی روایات میں ان کے ربی قانون کے مطابق ان کو اس احاطے میں پاؤں رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے مبادا کہ اس مقدس خطے کی بے حرمتی ہو جائے۔ درحقیقت اس حرم شریف کے احاطے کے باہر (جس میں مسجد اقصیٰ، گنبد صخریٰ، اور کئی مدارس شامل ہیں) ایک بورڈ اب بھی آویزاں ہے جس پر یہودیوں کو حرم شریف کے اندر قدم رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے ہم یہ معلوم کرتے ہیں کہ پہلے پہل مسجد اقصیٰ کو کس نے تعمیر کیا۔ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ اسے باپ بیٹا حضرت داؤد اور

حضرت سلیمان علیہما السلام نے تعمیر کیا۔ لیکن کیا یہ اس سے پہلے بھی تعمیر کی گئی تھی؟ ہمیں قرآن کریم سے پتہ چلتا ہے کہ باپ بیٹا حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے کعبہ تعمیر کیا۔ (سورۃ البقرہ ۱۲۷، ۱۲۸)۔ مکہ شہر میں یہ کعبہ زمین پر اللہ کا پہلا گھر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنایا گیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہؑ کو اللہ کے حکم سے اس جگہ آباد کیا۔

حضرت ابراہیمؑ خود مکہ شہر میں سکونت پذیر نہیں ہوئے۔ انھوں نے فلسطین میں شہر الخلیل میں رہائش اختیار کی جو انہی کے نام (خلیل اللہ) سے منسوب ہے۔ اس بات کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے مکہ میں تو اللہ کی عبادت کے لیے کعبہ تعمیر کیا تھا لیکن فلسطین جہاں وہ خود رہائش پذیر تھے کوئی عبادت گاہ انھوں نے تعمیر نہیں کی۔ حقیقت یہی ہے کہ امام الانبیاء ہونے کی حیثیت میں انھوں نے شہر الخلیل کے قریب بیت المقدس میں یہ عبادت گاہ تعمیر کی تھی جسے اس وقت ''بیتل'' (عبرانی زبان میں اللہ کا گھر) کہا گیا۔

جب ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے اور الخلیل شہر میں ہی بلوغت کی عمر کو پہنچے تو وہ بیت المقدس میں اس عبادت گاہ (بیتل) میں نماز ادا کرتے اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونے کے لیے جاتے تھے۔ حضرت اسحاقؑ نے اس گھر کو ان تمام لوگوں کے لیے عبادت گاہ قرار دیا جو اللہ پر اور ان کی نبوت پر ایمان لائے تھے۔ حضرت اسحاقؑ کعبہ میں عبادت کے لیے مکہ بھی گئے اور وہاں اپنے والد حضرت ابراہیمؑ اور بھائی حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ اللہ کے حکم سے حج کا فریضہ ادا کیا۔ یہ حضرت ابراہیمؑ تھے جنھوں نے ''بیتل'' کا نام مسجد اقصیٰ (یعنی دوری پر واقع مسجد) رکھا کیونکہ بیت المقدس مکہ سے کافی دور شمال مغرب میں واقع ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو اللہ کے رسول اور حضرت اسحاقؑ کے بیٹے تھے (جنھیں بائبل میں Jacob کہا گیا ہے) مسجد اقصیٰ کو تمام توحید پرست مومنین کے لیے مرکزی عبادت گاہ کے طور پر کھول دیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ فلسطین میں حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کے علاوہ اور بھی بہت سے قبائل آباد تھے جو فلسطینی کہلاتے تھے اور انہی کے نام پر یہ خطہ زمین فلسطین کہلایا۔ ان کے علاوہ وہاں موبیطی اور حطی قبائل بھی آباد تھے۔ حضرت سلیمانؑ کی والدہ ماجدہ کا تعلق حطی قبیلے سے ہی تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ موجودہ عراق کے شہر ''اُر'' میں پیدا ہوئے تھے اور عراق کے ظالم بادشاہ نمرود کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر اپنی اہلیہ محترمہ حضرت سارہؑ اور بھتیجے حضرت لوطؑ کے ساتھ وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو کر بالآخر فلسطین میں الخلیل شہر میں سکونت پذیر تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کی زندگی آپ کی اولاد میں مبعوث ہونے والے دوسرے انبیاء کی طرح بہت سے نشیب و فراز سے گزری۔ آپؑ کے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام بھی اللہ کے رسول تھے اور پھر ان کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام بھی اللہ کے برگزیدہ نبی تھے جن کی اولاد سے بنی اسرائیل کا آغاز ہوا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کو رسالت عطا کی گئی۔ حضرت یوسفؑ بچپن سے ہی اپنے والد کو بہت عزیز تھے جس کی وجہ سے ان کے سوتیلے بھائی ان کے دشمن ہو گئے اور انھیں قتل کرنے کا ارادہ کیا لیکن پھر انھیں ایک بے آباد کنوئیں میں ڈال دیا۔ اور پھر اللہ کے حکم سے وہاں سے گزرتے ہوئے ایک قافلے والوں نے ان کو کنوئیں سے نکالا اور مصر لے جا کر غلام کی حیثیت سے بیچ دیا۔ مصر کی حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار (عزیز مصر) نے ان کو اپنے گھر کے کام کاج کے لیے خرید لیا۔ جب آپ بڑے ہوئے تو آپ کے مردانہ حسن اور شخصی وجاہت کی وجہ سے عزیز مصر کی بیوی ان پر فریفتہ ہو گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اس کے ہتھکنڈوں سے محفوظ رکھا۔ اس کی سزا حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ ملی کہ ان کو طویل عرصہ کے لیے قید کر دیا گیا۔ قید خانے سے رہا ہونے پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مصر کی بادشاہت عطا کر دی۔ اس کی تفصیلات قرآن کریم کی سورۂ یوسف میں درج ہیں۔

جب یوسفؑ کو مصر میں اقتدار ملا تو انھوں نے اپنے خاندان، والد حضرت یعقوبؑ، والدہ اور بھائیوں کو فلسطین چھوڑ مصر میں ہی اپنے پاس بلا لیا۔ اور یہ لوگ پھر وہیں کے ہو رہے۔ اس طرح آپ کے خاندان میں سے کوئی بھی پیچھے فلسطین میں ایسا شخص نہ رہا جو ''بیتِل'' (مسجد اقصیٰ) کی دیکھ بھال کرتا۔ لیکن حضرت یعقوبؑ نے مسجد اقصیٰ کی نگرانی وہاں کے اصلی باشندوں فلسطینیوں کے سپرد کر دی۔ حضرت یعقوبؑ کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی اور یہ لوگ چار سو سال مصر میں رہے۔ تاریخ سے ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ اس طویل عرصے میں ان لوگوں نے کبھی دوبارہ فلسطین آ کر مسجد اقصیٰ کی نگرانی یا دیکھ بھال کرنے کی کوشش کی ہو۔

کئی نسلیں گزرنے کے بعد بنی اسرائیل سے مصر کی بادشاہت چھن گئی اور مصر کے اصلی باشندوں نے ان کو غلام بنا لیا۔ یہاں سے فرعونوں کا دور شروع ہوا۔ جنھوں نے بنی اسرائیل پر مظالم کی انتہا کر دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا جنھوں نے ان کو فرعون کی غلامی سے آزاد کرایا اور آپؑ کی قیادت میں یہ قوم بحیرہ احمر پار کر کے جزیرہ نما سینا میں داخل ہوگئی۔ اس وقت ان کی تعداد سات سے دس لاکھ کے درمیان تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ وہ دوبارہ فلسطین میں جا کر آباد ہو جائیں اور وہاں کے مشرک باشندوں کو وہاں سے بے دخل کر دیں۔ لیکن بنی اسرائیل نے بزدلی کا مظاہرہ کیا اور اللہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر ان کو یہ سزا ملی کہ چالیس سال صحرائے سینا میں ہی بھٹکتے رہے۔

اس دوران حضرت موسیٰؑ انتقال فرما گئے ان کے بعد حضرت یوشع بن نونؑ کی قیادت میں بنی اسرائیل دوبارہ فلسطین میں آباد ہو گئے۔ لیکن وہاں کے مشرک باشندوں سے ان کی مسلح کشمکش جاری رہی۔ یہاں تک کہ اللہ کے رسول حضرت داؤد علیہ السلام کی قیادت میں بنی اسرائیل کی ایک عظیم اور مستحکم سلطنت قائم ہوگئی۔ یہ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح کا زمانہ تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام چالیس سال حکمران رہے اور آپؑ کی وفات کے بعد آپ کے بیٹے، اللہ کے رسول، حضرت سلیمانؑ نے اقتدار سنبھالا۔ آپؑ نے مسجد اقصیٰ کو مقامی فلسطینیوں کی مدد سے دوبارہ تعمیر کیا۔ حضرت سلیمانؑ کا دور اقتدار بھی تقریباً چالیس سال پر محیط تھا۔ آپؑ کی وفات کے بعد یہ سلطنت کئی حصوں میں تقسیم ہوگئی اور بنی اسرائیل سے اقتدار چھن گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس قوم پر بدترین اخلاقی زوال کا دور شروع ہوا۔ یہ لوگ ہمسایہ مشرک قوموں کی دیکھا دیکھی شرک میں مبتلا ہو گئے اور ان قوموں سے رشتے ناطے کرنے شروع کر دیے۔ اس طرح ان کے گھروں میں شرک داخل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے پے در پے نبی بھیجے لیکن جو نبی بھی آتا اور ان کو ان کی گمراہیوں پر ٹوکتا تو وہ اس کے دشمن ہو جاتے، کسی کو جلاوطن کر دیتے، کسی کو قتل کر دیتے۔ بالآخر ان کے آخری دور میں اللہ تعالیٰ نے دو انتہائی برگزیدہ پیغمبر حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کی اتمام حجت کے لیے بھیجے۔ ان بدبختوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو شہید کر دیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی دانست میں سولی پر چڑھا دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی پھٹکار اس قوم پر پڑی اور انھیں قیامت تک کے لیے لعنت زدہ قرار دے دیا گیا۔ (آل عمران ۱۱۲)

اس مضمون میں اس سے پہلے یہ بات آ چکی ہے کہ ۵۸۷ قبل مسیح میں بابل کے مشرک حکمران بخت نصر نے فلسطین میں یروشلم (بیت المقدس) کا محاصرہ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا اور مسجد اقصیٰ کو مسمار کر دیا۔ بنی اسرائیل کا قتل عام کیا اور ان کی ایک کثیر تعداد کو وہاں سے بے دخل کر کے بابل لے جا کر غلام بنا لیا۔ ستر سال کی غلامی کے بعد ایران کے بادشاہ سائرس اعظم نے اللہ کے حکم سے انھیں آزادی دلوائی اور واپس فلسطین میں آ کر آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی جہاں سے اہل بابل نے انھیں بے دخل کر دیا تھا۔

یہود (بنی اسرائیل) نے حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے جو سلوک کیا تھا اس کی وجہ سے اللہ کا غضب ان پر نازل ہوا اور ستر عیسوی

میں اللہ تعالیٰ نے ان پر رومی سلطنت کو مسلط کر دیا۔ رومیوں نے یروشلم پر قبضہ کر کے ایک بار پھر اس عبادت گاہ کو مسمار کر دیا۔ یہودیوں کا قتل عام کیا اور ان کو فلسطین سے ایسا بے دخل کیا کہ تقریباً دو ہزار سال تک وہ اس سرزمین میں دوبارہ داخل نہ ہو سکے یہاں تک کہ ۱۹۴۸ء میں مغربی طاقتوں کی سازش سے ایک مصنوعی اور غیر قانونی ریاست اسرائیل وجود میں ائی۔ ستر عیسوی میں فلسطین پر قبضہ کے وقت رومن سلطنت شرک میں مبتلا تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تھی کہ یہود جو کہ حضرت عیسیٰؑ کے اصل وارث تھے وہ تو ان پر ایمان نہ لائے لیکن یہ مشرک لوگ ان پر ایمان لے آئے اور ساری رومی سلطنت نے عیسیٰ علیہ السلام کا دین (اسلام) قبول کر لیا۔ اس طرح ان کی یہودیوں سے دشمنی اور بھی بڑھ گئی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا تھا۔

اس وقت رومن سلطنت کے علاوہ ایک اور سپر پاور ایرانی سلطنت کی شکل میں موجود تھی اور ان دونوں طاقتوں کی آپس میں اکثر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ۶۱۴ عیسوی میں ایرانیوں نے فلسطین اور اس کے علاوہ رومی سلطنت کا ایک وسیع علاقہ ان سے چھین لیا اور یروشلم (بیت المقدس) کا کنٹرول ان کے قبضے میں چلا گیا یہ تقریباً چھ نبوی کا واقعہ ہے جبکہ نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے اور آپ کو نبوت عطا ہوئے سات سال ہو چکے تھے۔ رومیوں کی اس شکست پر مکہ کے مشرکین نے جشن منایا اور مسلمانوں کا مذاق اڑایا کیونکہ انبیاء کو ماننے والے رومی آتش پرست ایرانیوں سے شکست کھا گئے تھے۔ قرآن کریم میں سورۂ روم کی ابتدائی آیات میں اس واقعہ کا ذکر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ پیشین گوئی کی کہ دس سال سے کم عرصے میں دوبارہ رومی غالب آئیں گے اور ساتھ ہی یہ خوش خبری دی کہ اس سال اللہ تعالیٰ کی نصرت سے مسلمان بھی کافروں کو شکست دے کر ان پر غالب آ جائیں گے۔

یہ خوش خبری اس وقت دی گئی جبکہ مسلمان انتہائی قلیل تعداد میں تھے اور مکہ کے مشرکین کے ظلم وستم کا شکار ہو رہے تھے۔ کچھ لوگ اس ظلم وستم سے تنگ آ کر حبشہ کی جانب ہجرت کر چکے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا۔ مسلمانوں کے کفار پر غلبہ کی اس پیشین گوئی کا کفار قریش نے خوب ٹھٹھا اڑایا لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم پورا ہوا اور مقررہ وقت کے اندر ہی سن ۲ ہجری میں مسلمانوں کو جنگ بدر میں مشرکین مکہ پر فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی جس کے بعد اسلام تیزی سے تمام عرب میں پھیلتا چلا گیا اور یہ وہی سال تھا جب رومیوں نے ایرانیوں کو دوبارہ شکست دی اور یروشلم (بیت المقدس) اور مسجد اقصیٰ پھر ان کے قبضے میں آ گئے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں آباد ہو گئے تو ابتدائی سترہ ماہ تک وہ مسجد اقصیٰ ہی کو قبلہ بنا کر نماز ادا کرتے رہے اس لیے اس مسجد کو مسلمانوں کا قبلۂ اول کہا جاتا ہے۔ پھر ہجرت کے دوسرے سال ایک دن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز کی امامت کرا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا اور مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کی بجائے مکہ مکرمہ میں مسجد الحرام کی طرف پھیر دیا گیا۔ (سورۃ البقرہ ۱۴۲، ۱۴۳) مدینہ کی جس مسجد میں اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ ظہر کی نماز پڑھا رہے تھے اس کے نام مسجد قبلتین (دو قبلوں والی مسجد) رکھ دیا گیا۔

بالآخر ۶۳۸ عیسوی میں مسلمانوں نے بیت المقدس کو حضرت عمرؓ کی خلافت کے دوران رومی عیسائیوں کے تسلط سے آزاد کرا لیا۔ شہر کے رومی گورنر سوفرینیس (Sopronius) نے اس بات پر اصرار کیا کہ وہ شہر کی چابیاں خود مسلمانوں کے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر سپرد کرے گا۔ حضرت عمرؓ اس وقت گولان کی پہاڑیوں میں ایک مہم میں مشغول تھے، جب آپ کو یہ پیغام پہنچا تو آپ فوراً بیت المقدس پہنچے اور بغیر کسی خون خرابے کے شہر کا قبضہ حاصل کر لیا۔

جب حضرت عمرؓ شہر میں داخل ہوئے تو انھوں نے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے موقع پر آسمانوں کے

سفر پر جانے سے پہلے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی نماز کی امامت کرائی تھی۔اس جگہ کو اچھی طرح صاف کر کے حضرت عمرؓ نے وہاں نماز پڑھائی اور آپ کے حکم سے وہاں ایک مسجد عارضی طور پر تعمیر کر دی گئی جو بعد میں مختلف مرحلوں میں موجودہ مسجد اقصیٰ کی صورت اختیار کر گئی اور اس وقت سے اب تک مسلمانوں ہی کے زیر انتظام رہی۔

حرم شریف کے اسی احاطے میں اس کے بعد ایک اور شاندار عمارت تعمیر ہوئی جسے گنبد صخرہ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک بہت وسیع سنہری گنبد ہے۔ بنوامیہ کے حکمران خلیفہ عبدالملک نے اس عمارت کو پچاس سال بعد اس چٹان پر تعمیر کیا جس سے حضوؐر کی آسمانی سواری براق کو بیت المقدس کے مختصر قیام کے دوران باندھا گیا تھا جبکہ آپؐ نے تمام انبیاء کی نماز میں امامت کرائی تھی۔

آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ کے سامنے ایک سیڑھی پیش کی گئی جس کے ذریعے سے آپ نے آسمانوں کا سفر شروع کیا۔اس وقت وہ چٹان جہاں سے آپ نے یہ سفر شروع کیا تھا اور جس سے براق کو باندھا گیا تھا آپ کے ساتھ ہی بلند ہونا شروع ہو گئی۔حضرت جبرئیلؑ نے آپؐ سے عرض کیا کہ آپ اس چٹان کو آپ کے پیچھے آنے سے منع کر دیں۔آپؐ نے اپنا پاؤں اس چٹان پر رکھ کر اُسے پیچھے آنے سے منع کر دیا۔اس وقت بھی اس چٹان پر آپؐ کے پاؤں کا نشان موجود ہے اور اب تک یہ چٹان اس طرح معلق ہے اور دھات کے ایک ٹکڑے کے ذریعے زمین سے جڑی ہوئی ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں مسجد صخرہ کا گنبد واقع ہے۔

بیت المقدس (یروشلم) کا شہر اور مسجد اقصیٰ ۱۰۹۹عیسوی میں صلیبی عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں سے چھن گئے۔فلسطین کے گردونواح میں جو مسلمان ملک تھے ان کے حکمران آج کے مسلمان حکمرانوں کی طرح بے دین ہو گئے تھے اور انھیں اسلام اور مسلمانوں کے دفاع کا کوئی خیال نہ رہا تھا۔یہی صورت حال ۸۸ سال جاری رہی یہاں تک کہ صلاح الدین ایوبی نے ظالم اور خونریزی کرنے والے صلیبیوں سے مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کو آزاد کرایا۔

بدقسمتی سے مسلمان سلطنتوں کے زوال اور مسلمان امت کے بگاڑ کی وجہ سے یہ ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن گئی۔ یہ کام کئی مرحلوں میں ہوا۔ جب خلافت عثمانیہ کو بیسویں صدی کے اوائل میں شکست سے دوچار ہونا پڑا اور برطانوی سامراج نے فلسطین کا کنٹرول سنبھال لیا اور اپنے خاص نو آبادیاتی طرز پر مسلمانوں کی سرزمین دوسروں کو بانٹنی شروع کی۔ اس سے پہلے صورت حال یہ تھی یورپی قوموں نے کبھی اپنے درمیان یہودی قوم کو برداشت نہیں کیا تھا۔ اور اس کے لیے ان قوموں نے مسلسل متعدد اقدام کیے۔لیکن جب ۱۹۱۸ء میں برطانیہ نے فلسطین پر قبضہ کیا تو انھوں نے اس سرزمین کو یہاں کے مقامی مسلمانوں کے حقوق یکسر نظرانداز کرتے ہوئے یہودیوں کے لیے ان کے مستقل وطن کے طور پر ان کے سپرد کرنے کا عندیہ دیا۔ پھر جب ۱۹۴۸ء میں ایک صیہونی ریاست عملاً قائم کر دی گئی تو فلسطین کا ساٹھ فیصد علاقہ ان کے قبضہ میں دے دیا گیا۔ باقی علاقے پر انھوں نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کر لیا۔اس میں بیت المقدس شہر کا مشرقی حصہ بھی شامل تھا جس میں مسجد اقصیٰ اور گنبد صخریٰ واقع ہے۔

یہی صورت حال اب بھی موجود ہے۔مسجد اقصیٰ بلکہ سارا حرم شریف صیہونیوں کے قبضے میں ہے اور وہ اس کو مسمار کرنے کے درپے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے یہودیوں کو ہمیشہ اپنی حکومتوں میں امن فراہم کیا جبکہ وہ دوسری قوموں کے ظلم وستم کا شکار ہوتے رہے لیکن یہودی مسلمانوں کے لیے پوری انسانی تاریخ میں بدترین ظالم واقع ہوئے ہیں۔اور مقامی فلسطینی مسلمانوں پر انھوں نے ہر طرح کی زیادتیاں روا رکھی ہیں۔ مسلح یہودی معمولی معمولی باتوں پر فلسطینیوں کو گولی مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے اور ان کی زندگی کا کوئی احترام نہیں کرتے۔

بدعنوان مسلمان حکمران مکمل طور پر سامراجی اور صیہونی قوتوں کے غلام بنے ہوئے ہیں، ان سے مسلمانوں کو اس ظلم سے نجات دلانے کی کوئی امید بالکل عبث ہے۔ اس کے لیے ایک صلاح الدین ایوبی کی ضرورت ہے جو مسجد اقصیٰ اور فلسطین کو یہودی صلیبیوں سے آزاد کرائے۔

اس وقت تک مسلمان خدائے عزیز و مقتدر سے دعا ہی کر سکتے ہیں کہ وہ ایسا دن جلد لائے۔ لیکن ایک اچھی بات اور اہم ضرورت یہ ہے کہ مسلمان اپنی تاریخ سے بہتر طور پر باخبر رہیں جسے وہ زیادہ تر بھلا چکے ہیں۔

(بشکریہ: کریسنٹ انٹرنیشنل، ترجمہ: ڈاکٹر مقبول احمد شاہد)

☆......☆......☆

یہ عنوان قاری کے لیے کچھ انوکھا یا اچھوتا نہیں لیکن ایک زمانہ قبل اس منبر مبارک سے کچھ ایسے سانحات وابستہ ہیں کہ ان کے پیش نظر بیت اللہ میں حجر اسود کے ساتھ قرامطہ کے ہاتھوں رونما ہونے والے حادثات یاد آ جاتے ہیں جب ۳۱۹ھ میں وہ اس پتھر کو اکھاڑ کر لے گئے تھے اور ۳۳۹ھ میں اسے واپس اپنے مقام پر نصب ہونا نصیب ہوا تھا۔

اب ریاض الجنۃ میں یہ منبر مبارک اُسی جگہ رکھا ہوا ہے جہاں حضوؐر کے زمانے میں رکھا ہوتا تھا۔ ستون فسانہ کی گریہ زاری سب کے علم میں ہے جب حضوؐر منبر سے نیچے تشریف لا کر اس تنے سے بغل گیر ہوئے۔ اُسے قرار تو آ گیا اس کے رونے سے اس اونٹنی کے درد و کرب کا علم ہوتا ہے

گزرا ہوا زمانہ

منبر مصطفیٰ ﷺ

دانش یار

جب وہ دردِ زہ میں مبتلا ہوتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے محسوس کیا کہ جب آپ کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے ہیں تو آپؐ نقاہت و اضمحلال محسوس کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق منبر بنانے کی تجویز حضرت تمیم الداریؓ نے پیش کی تھی۔ یہ پہلا منبر ۸ھ میں تیار ہوا تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ منبر بنانے کا خیال پہلے پہل ایک انصاری مرد اور خاتون کے ذہن میں آیا تھا۔ منبر کی تیاری کے لیے مدینہ منورہ کے شمال مشرق میں واقع جنگل الغابہ سے شیشم کی لکڑی لائی گئی تھی۔

حضوؐر نے منبر کا پہلی دفعہ استعمال جمعۃ المبارک کے خطبہ سے کیا تھا۔ ستون فسانہ اب بھی محراب النبوی شریف کی پشت کے ساتھ متصل ہے۔ محراب النبی کے اوپر اسی ستون پر استوانہ مخلقہ لکھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ چونکہ اس ستون کو حضوؐر دوران خطاب سہارے کے لیے استعمال کرتے تھے اس لیے بعض صحابہؓ حضوؐر کی من بھاتی خوشبو اس ستون پر مل دیتے تھے۔ یہ خوشبو خلوق کہلاتی تھی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حوالے سے بیان ہوا ہے کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب کے ایک غلام صباح تھے جنھوں نے پہلا منبر تیار کیا تھا۔ اس کے اوپر والے تیسرے زینے پر حضوؐر دورانِ خطاب تشریف رکھتے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ اپنی خلافت کے ساتویں سال منبر پر اسی جگہ بیٹھتے تھے جہاں آں حضوؐر تشریف رکھا کرتے تھے۔ اس سے قبل حضرت عثمان غنی کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے نفیس ریشمی قبطی کپڑے کا غلاف منبر شریف کے لیے بنوایا تھا۔

۶۵۶ھ میں یمنی حاکم ملک المظفر شمس الدین نے صندل کی لکڑی کا منبر بنوا کر مدینہ طیبہ روانہ کیا جو دس سال تک مسجد نبوی میں رہا۔ ۶۶۶ھ میں مصر کے سلطان رکن الدین بیبارس بندقداری نے نیا منبر بنوا کر حرم نبوی میں بھجوایا۔ اس منبر کے نو زینے تھے۔ اس کی اونچائی چار ذرع (دو میٹر) تھی۔

المراغی کہتے ہیں: سلطان بیبارس کا مذکورہ منبر ۱۳۲ سال تک موجود رہا۔ امتدادِ زمانہ سے دیمک لگ جانے کی وجہ سے اس میں کچھ شکست و ریخت کے آثار نمودار ہوئے تو مصری سلطان ظاہر مرقوق نے ۷۹۷ھ میں نیا منبر بنوا کر بھجوایا۔ انھوں نے یہ منبر شام کے ماہر چوب کاروں سے بنوایا اور خصوصی محملوں میں مدینہ منورہ پہنچایا۔

بدقسمتی سے ۸۸۶ھ میں آسمانی بجلی گرنے سے مسجد نبوی شریف کا کافی حصہ تباہ ہوا تو یہ منبر بھی اس آتشیں حادثے کا شکار ہو گیا۔ اہل مدینہ نے پھر اینٹوں کا منبر تعمیر کروایا۔ اہل مدینہ ابتدا سے ہی جس طریقے سے اینٹیں لگایا کرتے تھے اس کو عرب ''السمیط'' (Al-Sumayt) کہتے تھے۔ بعد میں اینٹیں لگانے کا ایک دوسرا طریقہ بھی اپنایا گیا اس کو معماروں کی زبان میں السعیدہ (Al-So'aidah) کہتے تھے۔ (صفحہ ۴۳۲، جستجوئے مدینہ جلد دوم، از عبدالحمید قادری)۔ یہ منبر دو سال تک استعمال ہوتا رہا۔ ۸۸۸ھ میں مصری سلطان قیتبائی نے سفید سنگ مرمر سے عالی شان منبر بنوا کر بھیجا۔ یہ تقریباً ایک سو سال تک مسجد نبوی میں استعمال ہوا۔ پھر کسی وقت اسے مسجد قبا میں منتقل ہوا اور آج بھی وہیں امام مسجد قبا اس پر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر خطبہ دیتے ہیں۔ پھر ۹۹۹ھ میں عثمانی سلطان مراد خان نے ایک نیا منبر بنوا کر مسجد نبوی شریف بھجوایا۔ یہ منبر ترکی صناعوں کی کاریگری کا ایک نادر نمونہ ہے اور آج بھی یہ منبر مسجد نبوی شریف میں رکھا ہوا ہے۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی حضرت عثمان غنیؓ کی روایت پر عمل کرتے ہوئے قبطی ریشمی کپڑے کا غلاف منبر شریف پر چڑھایا۔ اس کپڑے پر مناسب طریقے سے خوبصورت عربی خطاطی کی گئی تھی۔ یہ ہشام بن عروہؓ کی روایت ہے۔ بعد ازاں عباسی بادشاہوں نے بھی ہر سال منبر شریف کے لیے غلاف بھیجنا شروع کیا۔ لیکن فتنۂ تاتار میں عباسی خاندان انقلابات زمانہ کی نذر ہو گیا تو مصری سلاطین غلاف کعبہ کے ساتھ ساتھ غلافِ منبر نبویؐ بھی بھیجنے لگے۔ حجرہ مطہرہ کے لیے بھی ان کا کسوہ (غلاف) مدینہ طیبہ آتا رہا۔ وہ یہ کام ہر چھ سال بعد کرتے تھے۔

آگے بڑھنے سے قبل ایک حدیث پڑھ لیں۔ ''منبر شریف کے قریب جھوٹی قسم اٹھانے والے کو اپنا ٹھکانا جہنم کی آگ میں بنا ہوا ملے گا'' (السیوطی جامع الاحادیث) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ''میرا حوض کوثر ایلہ (یروشلم) سے یمن میں صنعا تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سے پینے کے جاموں کی تعداد آسمان کے ستاروں جتنی ہے۔''

اور اب ذرا دل تھام کر پڑھیے۔ ۵۰ھ میں امیر شام حضرت معاویہ بن ابوسفیان (رضی اللہ عنہما) حج ادا کر کے مدینہ منورہ آئے تو انھوں نے گورنر مدینہ مروان بن الحکم کو فرمان جاری کیا کہ وہ منبر شریف کو مسجد نبوی شریف سے اٹھوا کر دمشق روانہ کر دے۔ تاہم جب اس نے منبر شریف کو مسجد نبویؐ سے ہٹانے کی جسارت کی شہر مدینہ طیبہ میں کہرام برپا ہو گیا۔ نظام قدرت حرکت میں آیا۔ سورج شدید قسم کے گرہن میں ڈوب گیا۔ اس قدر ظلمت کا غلبہ ہوا کہ دن کو تارے دکھائی دینے لگے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اس منظر نے مروان پر دہشت طاری کر دی اور اسے وہ اپنے لیے برا شگون سمجھا۔ کھسیانا ہو کر کہنے لگا۔ ''میرا مقصد منبر شریف کو ہٹانے کا ہرگز نہ تھا بلکہ میں تو اس کی مرمت کرا کے اس کی اونچائی میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا چاروناچار اس کو منبر شریف میں چھ مزید زینے لگوا کر اس کے ارتفاع میں اضافہ کرنا پڑا۔ یوں مع کرسی کے زینوں کی تعداد (۹) نو ہو گئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے مداخلت کر کے شامی حکمرانوں کو اس ارادے سے باز رکھنے کے لیے کوشش کی تھی۔ شامی حکمران پھر باز نہ آئے۔ عبدالملک بن مروان اور ولید بن عبدالملک نے بھی مسجد نبوی شریف سے منبر مبارک کو دمشق لے جانا چاہتے تھے۔ اس پر گورنر مدینہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رکاوٹ بنے اور حضرت ابوہریرہؓ کے داماد جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن المسیب نے بھی اُن کو اس فعل سے باز رکھنے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا۔

میری ان معلومات کا ماخذ جناب عبدالحمید قادری کی تحقیقی تالیف جلد دوم کے صفحات ۴۴۷-۴۵۴ ہیں۔ مرحوم کی یہ کتاب ۲۰۰۷ء میں ۲۰x۲۷

سنٹی میٹر سائز کے کاغذ پر شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے اسے آرٹ پیپر پر عشق کی سرشاری سے رنگین تصاویر کے ساتھ ۹۰۶ صفحات پر چھاپا اس وقت اس کتاب کا ہدیہ -/۳۶۰۰ روپے تھا۔ (اورینٹل پبلی کیشنز پاکستان، دربار مارکیٹ گنج بخش روڈ لاہور۔ فون ۳۶۳۶۳۰۹-۰۴۲) میں نے اس کتاب کی ثقاہت اور اس کے استناد کے معیار کے لیے محترم محقق العصر حضرت مولانا مفتی محمد خان قادری مدظلہ، کی رائے دریافت کی۔ انھوں نے اس تالیف کو سراہا اور یہ بھی بتایا کہ موصوف آج کل ریاض (دارالحکومت مملکت سعودیہ) میں مقیم ہیں۔ گزشتہ چودہ صدیوں میں امت مسلمہ کے قابل قدر اسلاف کے بیشتر علمی کارناموں کے حوالے دے کر انھوں نے اپنی ہر بات کو مستند بنایا ہے۔

نوٹ: ۱۳۹۳ھ میں سعودی حکومت نے اس منبر کی تزئین و آرائش کی۔ سلطان مراد کے بنائے ہوئے اس منبر شریف کو خادم الحرمین شریفین شاہ فہد کے دور حکومت میں مسجد نبوی شریف میں توسیع کے وقت مرمت کیا گیا۔ سعودی حکومت نے ۱۴۰۳ھ میں اس منبر پر سونے کی تلمیع کروادی۔ اور اس کا دروازہ نئے سرے سے لگوایا۔

☆......☆......☆

نعت

اے حبیب خدا میں پڑا ہوں یہاں مجھ کو آواز دے کر بلا لیجیے
کس طرح بڑھ کے میں دیکھ لوں آستاں مجھ کو آواز دے کر بلا لیجیے

رونقِ دوجہاں مونس بے کساں ہادیٔ انس و جاں شاہِ کون و مکاں
اشک آنکھوں سے ہیں مدتوں سے رواں مجھ کو آواز دے کر بلا لیجیے

اب تو امت بنی امتِ بے زباں جس کی آہوں میں باقی نہیں کچھ دھواں
میں ہوں امت کا خاموش ماتم کناں مجھ کو آواز دے کر بلا لیجیے

کب ہو قسمت میں طیبہ کی جانب سفر دیکھوں کیسے مدینہ کی شام و سحر
میں تڑپتا ہوں کب سے تہہِ آسماں مجھ کو آواز دے کر بلا لیجیے

بن کے عاشق شہودؔ آپ کا بے نوا کر رہا ہے یہی آپ سے التجا
آرزوئے زیارت میں جاتی ہے جاں مجھ کو آواز دے کر بلا لیجیے

شہودؔ ہاشمی

غزل

بدن کی خاک اور آنکھوں کا پانی چھوڑ جاؤں گا
میں دریا ہوں بہاؤ میں روانی چھوڑ جاؤں گا

مجھے معلوم ہے آخر کسی دن تیری دنیا سے
چلا جاؤں گا پر اپنی کہانی چھوڑ جاؤں گا

میں خود کو منتقل کردوں گا آنے والی نسلوں میں
میں اپنی اپنے بچوں میں جوانی چھوڑ جاؤں گا

مرے الفاظ زندہ ہیں انہیں زندہ ہی رہنا ہے
میں فانی ہو کے نقشِ غیرفانی چھوڑ جاؤں گا

میرا انجام ہی ہوگا مرے آغاز کا باعث
نئ دنیا کی خاطر یہ پرانی چھوڑ جاؤں گا

کدورت سے بھری دنیا بھی مجھ کو یاد رکھے گی
کرامتؔ میں محبت کی نشانی چھوڑ جاؤں گا

(کرامت بخاری)

غزل

کیوں دی تھی تمہیں دل نے صدا، یاد نہیں ہے
اب کوئی بھی جینے کی ادا یاد نہیں ہے

اک پل میں کھلا دیتا تھا جو غنچۂ دل کو
وہ تم تھے کہ تھی بادِ صبا یاد نہیں ہے

جلتا تھا بدن چاند کی کرنوں کی لپٹ سے
کیوں چاند یہ دیتا تھا سزا یاد نہیں ہے

پلکوں پہ شرارے تھے کہ پگھلے ہوئے تارے
کیا کیا تھا جو آنکھوں نے پیا یاد نہیں ہے

ہر عیب ہنر بن گیا دنیا کی نظر میں
لگتا ہے کہ لوگوں کو خدا یاد نہیں ہے

منظر تری رخصت کا قیامت سے سوا تھا
کب ہو گئے ہم خود سے جدا یاد نہیں ہے

معمور دل و جاں نگہِ شوق سے کر کے
راتوں کو سحر کیسے کیا یاد نہیں ہے

(نجمہ یاسمین یوسف)

مجھے مستور رہنے دو

(بموقع ۴ستمبر یومِ حجاب)

میں حکم رب پہ نازاں ہوں، مجھے مسرور رہنے دو
ردا ہے یہ تحفظ کی، مجھے مستور رہنے دو
مجھے رب قیمتی سمجھے، ہو جیسے سیپ میں موتی
یہ قدر افزائی ہے اس پر مجھے مغرور رہنے دو
زمانے کی نظر گہنا نہ دے پاکیزگی میری
حیا کے لعل و گوہر سے مجھے پر نور رہنے دو
مجھے خالق نے خود تخلیقِ انسان کا شرف بخشا
مجھے اس منصبِ تخلیق پر مامور رہنے دو
نہیں محتاج میری ذات مصنوعی سہاروں کی
حیا کی پاسداری سے مثالِ حور رہنے دو
میرے سر پر جو چادر ہے میرے ایماں کا سایہ ہے
اسی سائے کی ٹھنڈک سے ہر اک غم دور رہنے دو
برہنہ کر دے انسان کو یہ ہے شیطان کا حربہ
سو تم شیطاں کو اپنی ہار پر مجبور رہنے دو
میں اپنے دیں پہ شیدا ہوں، یہ میرا تاج ہے گویا
میرے اس دیں کی کرنوں کو میرا منشور رہنے دو
دعا ہے نازؔ کی آقا کہ اس امت کو غیرت دے
میں اس امت کا مرکز ہوں مجھے غیور رہنے دو

روبینہ ناز

دعائے دل

الٰہی خاک میں باطل عزائم کو ملا دیجیے
الٰہی دشمنِ اسلام کا فتنہ دبا دیجیے

غزہ والوں پہ اسرائیل کو دیجیے نہیں غلبہ
اور ان سے قبلۂ اوّل کا قبضہ بھی چھڑا دیجیے

الٰہی فتح و نصرت بھیجئے ایمان والوں پر
حکومت اُمتِ مسلم کے ہاتھوں میں تھما دیجیے

مسلمانوں کو یکجائی عطا کردیجیے مولا!
انھیں ناقابلِ تسخیر اک قوت بنا دیجیے

جو دین حق کے منکر اور مسلمانوں کے دشمن ہیں
الٰہی دہر سے نام و نشاں ان کا مٹا دیجیے

میرے ہر شہر میں امن و اماں کردیجیے قائم
میرے اِس ملک کو اسلام کا قلعہ بنا دیجیے!

شمیم فاطمہ

بقائے امن کے لیے!

(چند اشعار آئی ڈی پیز کے نام)

پھر اب کے برس ہم پہ کڑا وقت پڑا ہے
پھر نقل مکانی کا ہمیں حکم ہوا ہے

پھر اس کے لیے چھوڑ چلے آئے ہیں سب کچھ
پھر پاک وطن کے لیے ایثار کیا ہے

گزرے تھے جس آلام سے آغاز سفر میں
درپیش ہمیں آج وہی کرب و بلا ہے

اپنوں نے گرفتار الم رکھا ہے ہم کو
دشمن بھی نشانے پہ لیے ہم کو کھڑا ہے

باہر نئی دیوار کھڑی کر تو رہے ہیں
اندر گو اکائی کا بھرم ٹوٹ رہا ہے

آجائے میسر میرے اس پاک وطن کو
وہ امن و اماں جس کے لیے جوگ لیا ہے

شمیم فاطمہ

افشاں نوید

تسبیح فاطمہ

حضرت حذیفہ بن یمانؓ وہ صحابی رسولؐ ہیں جو خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

''لوگ رسول اللہؐ سے خیر کے بارے میں سوال کیا کرتے اور میں شر کے بارے میں سوال پوچھتا اس خوف سے کہ کہیں یہ شر مجھے نہ آ پکڑے۔'' (بخاری، مسلم)

یہ بھی روایات ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے بارے میں صرف حضرت حذیفہؓ کو مطلع فرمایا تھا اس لیے جو منافق فوت ہوتا حضرت خذیفہؓ اس کی نماز جنازہ نہ پڑھتے جس سے اور اصحاب پر بھی اس کا نفاق کھل جاتا۔ اصحاب رسولؐ ایمان کے بلند ترین درجوں پر ہونے کے باوجود نفاق سے اتنے محتاط رہتے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب جن کو عشرہ مبشرہ میں ہونے کا شرف حاصل ہے حضرت حذیفہؓ سے تنہائیوں میں جا کر سوال کرتے ہیں کہ ''اللہ کی قسم تم بتاؤ کیا میں بھی ان منافقین میں سے ہوں؟ حضرت حذیفہؓ نے جواب دیا کہ ''نہیں'' اور کہا کہ آپؓ کے بعد میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔'' (ابن ابی شیبہ ۷/۴۸۱)

حضرت حذیفہ بن یمانؓ نبی پاکؐ کے رازدار تھے اور ان کے سینے میں یہ امانت تھی کہ ان کو منافقین کے نام آپؐ نے بتا دیے تھے۔ گویا وہ مسلمانوں کی انٹیلی جنس کے اہم رکن تھے۔ چونکہ حضرت حذیفہؓ فتنوں کے بارے میں سوال کرتے تھے اور کرید کرتے تھے کہ خود کو بچا سکیں اس لیے اصحاب رسولؐ میں بھی آپ کو خاص مقام حاصل تھا۔ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں مذکور ہے کہ اہم ترین معاملات میں حضرت حذیفہؓ کی رائے کو خصوصی اہمیت دیتے تھے۔

نیکی کرنا ایک الگ بات ہے اور فتنوں سے بچنا ایک الگ بات۔ بہت سے بہت بڑی بڑی نیکیاں کرنے والے لوگ فتنوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یوں اپنے اعمال ''حبط'' کرا لیتے ہیں...... اور مومن کی دانشمندی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا، یعنی فتنہ کا علم ہونے پر فوری بچاؤ کا سامان کر لیتا ہے۔ ایک مضبوط فوج اگر اپنی قوت کا ادراک رکھتی ہے تو اپنے دشمن کے ٹھکانوں اور اس کی کمزوریوں کا بھی علم رکھتی ہے۔ فاتح ٹیم کے کھلاڑی اپنی حکمت عملی ترتیب دیتے ہوئے مقابل ٹیم کی کمزوریوں سے بھی بخوبی آگاہ ہوتے ہیں...... زندگی جو اک معرکہ خیر و شر سے عبارت ہے، شر کی قوت، اس کے ٹھکانے اور اپنے نفس کی کمزوریوں کا احاطہ کرتے ہوئے ہم فتنوں سے بچنے کی کماحقہ کوشش کر سکتے ہیں...... کچھ صورتوں میں نیکی کرنا آسان لیکن فتنوں سے بچنا بہت مشکل نظر آتا ہے...... اللہ کی رحمت اور خاص استعانت حاصل ہو تب بھی فتنوں سے بچا جا سکتا ہے...... جب فتنوں کا علم ہو گا تو بچنے کی سعی بھی ہو گی...... اور امت کے اس آخری دور کو تو یوں بھی فتنوں کا دور کہا گیا ہے......

آیئے حضرت حذیفہ بن یمانؓ کی مجلس میں چلتے ہیں...... ان سے شر اور فتنے کے بارے میں جانتے ہیں کہ وہ نبی کریمؐ کے خاص رازدار اور فتنوں کے بارے میں سب سے زیادہ باعلم صحابی تھے۔ فرماتے ہیں کہ ''یہ فتنے ایسے لمبے ہو جائیں گے جیسے گائے کی زبان لمبی ہو جاتی ہے۔ ان فتنوں میں اکثر لوگ تباہ ہو جائیں گے۔ البتہ وہ لوگ بچ رہیں گے جو پہلے سے ان فتنوں کو پہچانتے ہوں گے۔ (احادیث حذیفہ فی الفتن۔ جلد اول، صفحہ ۹۴) اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے الفاظ ہیں کہ ''اس فتنے کے شر سے وہی بچ پائے گا جو ڈوبنے والے کی طرح دعا کرے گا۔''

(الفتن ۳۶۳۔راوی ابونعیم)

حضرت حذیفہؓ نے فرمایا: ''تم اپنے دین میں جو پہلی چیز گنوا بیٹھو گے وہ خشوع ہے اور آخری چیز جو تم اپنے دین میں کھودو گے وہ نماز ہے اور اسلام کی کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹیں گی۔'' (متدرک۔ حاکم)

ایک مرتبہ حضرت حذیفہ نے فرمایا ''میں امت محمدیہ کے دو جہنمی گروہوں کو اچھی طرح جانتا ہوں ایک گروہ کہے گا ہم سے پہلے والے گمراہ تھے دن رات میں پانچ نمازوں کی کیا وجہ ہے؟ بلاشبہ نمازیں تو صرف دو ہی ہیں عصر اور فجر۔ اور دوسرا گروہ کہے گا کہ بلاشبہ ایمان تو کلام (کلمہ پڑھنے کا نام) ہے، خواہ کوئی زنا کرے یا قتل کرے۔'' (متدرک حاکم، ابن ابی شیبہ)

ہم اسلام کے جس دور سے تعلق رکھتے ہیں اس میں لوگوں کا یہی خیال ہے کہ مسلمان جو چاہے کرتا رہے، جتنی کرپشن کر لے، ڈاکے ڈالے، جھوٹ بولے، اپنے عہدوں کا ناجائز استعمال کر لے، رشوت دے اور لے، سودی کاروبار کرے یا ناجائز منافع خوری اور ذخیرہ اندوزی کرے یا سماج میں جو بھی فتنہ پھیلائے یا بے حیائی کی تشہیر کرے وہ مسلمان اسلام سے خارج نہیں ہے۔

حالانکہ اس باب میں علمائے امت کی بیان کردہ تفصیل اور بڑے بڑے فقہا کے فتاویٰ موجود ہیں۔ لیکن اس وقت مسلمانوں جیسا نام ہونا کافی ہے خواہ اعمال ایسے ہوں کہ انھیں دیکھ کر یہود شرما جائیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایمان کلمہ پڑھ لینے کا نام ہے، ان کے اعمال سے ان کا ایمان متاثر نہیں ہوگا۔

آیئے حضرت حذیفہؓ کی بیان کردہ اس اگلی حدیث کی روشنی میں اپنے سماج کے خدوخال دیکھتے ہیں۔

مسند احمد میں روایت ہے کہ حضرت حذیفہؓ نبی کریمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ''مستقبل میں ایسے حکمران ہوں گے جو جھوٹ بولیں گے اور ظلم کریں گے۔ سو جس نے ان کے جھوٹ کی تصدیق کی اور ان کے ظلم میں ان کی مدد کی تو وہ ہم (مسلمانوں) میں سے نہیں اور نہ میں ان میں سے ہوں اور وہ حوضِ کوثر پر میرے قریب نہ آسکیں گے اور جس نے ان (امراء) کے جھوٹ کی تصدیق نہ کی اور نہ ان کے ظلم میں ان کی مدد کی تو وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ اور وہ جلد میرے پاس حوضِ کوثر پر آئے گا۔'' (مسند احمد)

ہمارے سیاسی نظام میں جو جس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے اس کے ہر صحیح اور غلط کو دلیل سے ثابت کرتا ہے۔ پارٹی کے کارکن قائدین کے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے پر سارا زور صرف کرتے ہیں۔ کسی پارٹی کا کارکن کبھی اپنی حکومت کو ظالم اور بدعنوان نہیں کہتا نہ قائدین کی ناانصافیوں پر انھیں کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا ہے۔

حضرت ابویحیٰ نے فرمایا، حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے منافق کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا ''وہ شخص جو اسلام کی تعریف تو کرے لیکن اس پر عمل نہ کرے۔'' (مصنف ابن ابی شیبہ، ۱۱۵/۵)

اسلام کی خوبیاں ہم میں سے کون ہے جو بیان نہیں کرتا۔ گھنٹوں ہم اسلام کی تعلیمات کے محاسن بتانے پر صرف کر سکتے ہیں، لیکن جب اپنی زندگیوں پر نظر ڈالیں تو ہم نے بھی اسلام کو ضمیمہ کے طور پر اپنی زندگیوں کے ساتھ لگا رکھا ہے۔ بلکہ ہمارے نام نہاد دانشور تو اسلامی حدود وقوانین کے خلاف کھلم کھلا زہر اگلتے ہیں۔ اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ قرار دیتے ہیں (معاذ اللہ) اور ہر کس و ناکس کے لیے اجتہاد کے حق کی بات کرتے ہیں ......اللہ کو مانتے ہیں لیکن اللہ کی ماننے کے لیے ان کے نفس آمادہ نہیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا ''ہم نبی کریمؐ کے پاس بیٹھے تھے۔ آپؐ نیند فرما رہے تھے۔ ہم نے دجال کا ذکر چھیڑا تو آپؐ نیند سے بیدار ہو گئے۔ آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو رہا تھا۔ فرمایا، دجال کے علاوہ مجھے دجال سے زیادہ تمھارے بارے میں جس چیز کا خوف ہے وہ گمراہ کرنے والے

قائدین ہیں (حضرت حذیفہؓ نے فرمایا) میں نے پوچھا یارسول اللہ آپ ہمیں ان کی نشانی بتا دیجیے۔ تو آپؐ نے فرمایا وہ ہم ہی میں سے ہوں گے اور ہماری زبان میں بات کریں گے۔'' (مصنف ابن ابی شیبہ، مسند احمد، مسند ابی یعلیٰ)

گمراہ کرنے والے قائدین کے سخت فتنے میں اس وقت پاکستانی قوم مبتلا ہے۔ مسلم امہ میں بھی ایسے قائدین سب کو نظر آ رہے ہیں جو دجالی لشکروں کی تقویت کا باعث ہیں۔ ہر طبقہ فکر اپنے علماء کو علماء حق اور دوسروں کے علماء کو علمائے سو کہتے اور سمجھتے ہیں۔

اللہ رب العزت دجالی فتنوں کے اِس دور میں ہمارے ایمان کی حفاظت فرمائے جس دور کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا کہ ان فتنوں میں آدمی صبح کو مومن ہوگا اور شام کو کافر ہو جائے گا۔ لوگ اسی حالت پر رہیں گے یہاں تک کہ دو خیموں میں بٹ جائیں گے۔ ایک ایمان والوں کا خیمہ ہوگا جس میں بالکل نفاق نہیں ہوگا۔ دوسرا نفاق والوں کا خیمہ جس میں ایمان نہیں ہوا۔ تو جب تم لوگ اس طرح تقسیم ہو جاؤ تو بس دجال کا انتظار کرنا کہ آج آئے یا کل آئے۔ (مسند احمد، ابوداؤد، حاکم)

اللہ تعالیٰ ہر خفیہ اور نظر آنے والے فتنے سے ہماری حفاظت فرمائیں۔ اس تحریر کا اختتام عبداللہ بن مسعودؓ کی اس خوبصورت روایت پر کروں گی کہ ''علم کثرتِ روایت کا نہیں بلکہ علم خشیت کا نام ہے۔'' (احیاء العلوم)

☆......☆......☆

قانتہ رابعہ

تجربہ

بہت دیر سے حفصہ دادی کی گود میں گھسی اپنا دکھڑا رو رہی تھی۔ کبھی اس کی آواز شدت جذبات سے بلند ہو جاتی اور کبھی ایک دم سسکیوں سے رونا شروع کر دیتی۔ دادی بی بہت دیر تک تو اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر پھیر کے اس کا دکھ سنتی رہیں۔ پھر چپ بھی کروایا مگر حفصہ قابو میں نہ آ رہی تھی......بس ''میرے ساتھ ایسے کیوں ہوا؟'' کا سوال مسلسل ڈنگ مار رہا تھا۔ بالآخر دادی بی کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔

''تو تمھیں کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ تم ضرور جاؤ اپنی امیر کبیر دوست کی سالگرہ میں......اور اگر چلی ہی گئی تھیں تو کس نے کہا تھا کہ ضرور ہی مرغ مسلم اور روسٹ کھانے کو ملے گا......''

''اف......فوہ......'' حفصہ پھٹ پڑی۔ ''دادی بی مجھے اس بات پر رونا نہیں آ رہا کہ اس نے مرغ مسلم کیوں نہیں کھلایا، مجھے اس بات کا بھی دکھ نہیں کہ جسے میں نے لیگ پیس سمجھ کر اٹھایا تھا وہ آلو کا بہت بڑا بیسن میں تلا ٹکڑا کیوں تھا۔ مجھے اس بات کا بھی صدمہ نہیں کہ میں اچانک نمرہ کو بلانے چھوٹے ڈرائنگ روم میں گئی تو وہ بچی ہوئی پیپسی گلاسوں سے اکٹھا کر کے نیا گلاس بھرنے میں کیوں مصروف تھی......''

''تو تمھیں کس بات کا دکھ ہے اب یہ بھی بتا دو۔'' اس کی طویل لن ترانیاں سن کر دادی بی نے کہا۔

''دادی بی مجھے یہ دکھ ہے کہ بظاہر اتنے دولت مند بڑے بڑے گھروں والے لوگوں کے دل اتنے چھوٹے کیوں ہوتے ہیں؟'' اس نے کہا۔

''ہاں یہ بات ٹھیک ہے، تمھیں اپنی توقع کے خلاف دیکھنا پڑا، امیروں، دولت مندوں کے متعلق خیالات کو شدید دھچکا لگا۔ تمھارا نازک سا دل اتنا کچھ سہار نہیں پایا اس لیے تمھارا یہ ردعمل فطری بات ہے......بات یہ ہے کہ مانو کہ نہ سارے امیر ایک جیسے تھڑدلے ہوتے ہیں نہ ہی سارے غریب کھلے دل کے......ہاں زیادہ تر ایسے ہی ہوتا ہے کہ زیادہ دولت دلوں کو سخت اور تنگ کر دیتی ہے......جیسے تمھارے معاملہ میں ہوا۔ کیا نام تھا تمھاری نئی سہیلی کا......'' انھوں نے یاد کرتے ہوئے پوچھا۔

''طوبیٰ......'' حفصہ نے منمنا کر کہا۔

''ہاں وہ طوبیٰ......اس نے تمھیں اپنی سالگرہ پر بلایا، پہلے بلانے کے لیے منت ترلہ کیا پھر اپنے فارم ہاؤس پر لے جانے کے لیے گاڑی بھیجنے کا پروگرام بنایا......جب جانے کا وقت ہوا تو معذرت کر لی کہ گاڑی تو مصروف ہے خود ہی آ جاؤ......ایسے ہی ہوا ناں......'' دادی اماں نے پوچھا۔

''ہاں......اور رکشے والے نے فارم ہاؤس کے پورے اڑھائی سو روپے صرف جانے کے لیے جو میں نے اپنا جیب خرچ جمع کر کے ادا کیے......سالگرہ پارٹی کے نام پر وہاں پکوڑے، نمکو اور دہی بھلے......ایک ڈش میں بالکل لیگ پیس کی شکل کے آلو کے بیسن والے پیس تھے......اب آپ کیا بتائیں ایمانداری سے پانچ سو روپے کا تحفہ خریدا اور اڑھائی سو روپیہ کرائے کا لگا کے یہ چیزیں ہی کھانا تھیں تو گھر میں کھا لیتے......'' دادی اماں ہنس پڑیں۔

''دل برا نہ کرو...... بات کھانے کھلانے کی نہیں تمھاری توقع کی ہے جو ختم ہوگئی۔ اب چھوڑو اس قصے کو ضروری تو نہیں کہ بڑے بڑے فارم ہاؤس میں رہنے والوں کو مہمانداری کا ڈھنگ بھی آتا ہو...... امیر ہو یا غریب، بس اللہ دل کا غنی بنائے......'' دادی اماں نے گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''اچھا تم اب اٹھو ہاتھ منہ دھو کر آؤ، میں تمھیں دل کی غنی، اپنی دوست کے ہاں لیے چلتی ہوں...... مزہ آجائے گا وہاں سب سے مل کر......''

حفصہ چھلانگ مار کے اٹھ بیٹھی لپک جھپک کے ہاتھ منہ دھویا اور دادی کے سر پر سوار ہوگئی۔

''چلیے دادی بی......''

دادی بی نے بھی چپل پہنی، کھونٹی پر لٹکی چادر اتاری اور پرس ہاتھ میں پکڑ کر چل پڑیں...... ''آپ کہاں جا رہی ہیں۔'' چند منٹ کے بعد حفصہ نے پوچھا...... اور کچھ دیر چلنے کے بعد ریلوے کے پرانے کوارٹرز کے سامنے جا رکیں۔

''اف کتنی بدبو آ رہی ہے......'' حفصہ نے ناک پر رومال رکھا...... ریلوے اسٹیشن کے قریب گندے پانی کا جوہڑ تھا جہاں مچھروں کی خانہ آبادی ہو رہی تھی اور خوب جشن کا سا سماں تھا۔

پہلی لین کے تیسرے کوارٹر کے آگے جا کر دادی بی رک گئیں۔ کوارٹر کا دروازہ کھلا تھا...... پیچھے مڑ کر دادی بی نے حفصہ کو مخاطب کیا۔

''یہ ہے پہلا فرق امیروں اور غریبوں کا...... غریبوں کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے ان کے دل کی طرح اور امیروں کے بڑے چھوٹے سب گیٹ بند ہی ملتے ہیں......'' ہلکی سی دستک دے کر دادی بی نے زور سے ''السلام علیکم'' کہا۔

''وعلیکم السلام اے کون ہے، فوزیہ ذرا دیکھنا۔'' برآمدے میں بچھے پلنگ پر بیٹھی بوڑھی خاتون نے کھیلنے میں مگن بچی سے کہا۔

''ہائے یہ تم ہو زہرا امتیاز...... بہت دنوں کے بعد آئیں۔'' دادی کو دیکھ کر وہ خاتون خوشی سے بولیں۔ حفصہ کے ماتھے پر پیار کیا، سینے سے لگایا...... اس کا نام پوچھا...... حفصہ کو یاد آیا اپنی دوست کے ہاں دو گھنٹے کے قیام میں گھر کے کسی بڑے فرد نے اندر آنا تو در کنار جھانک کر بھی نہ دیکھا تھا۔ امیروں غریبوں کے لائف سٹائل کا یہ دوسرا واضح فرق تھا۔ پھر کرسیاں کھینچ کر آگے کیں...... دونوں کو بٹھا کر فریج سے ٹھنڈا ٹھار پانی پلایا...... اتنے میں ان کی بہو، پوتیاں بیٹی سب جمع ہوگئیں۔

''ارے زہرہ آپا آئی ہیں؟ کیسی ہیں؟'' اچھا بھلا مجمع وہاں پر اکٹھا ہو گیا تھا...... کسی کو دادی کمزور لگی تھیں کسی کو موٹی، کوئی ان کے کپڑوں پر تبصرہ کر رہا تھا، کوئی ان کے کانوں میں پہنے جھمکوں پر، اس کے بعد بڑے سے برتن میں فالودہ آئس کریم آئی...... اور ان سب کو ساتھ شامل ہونے کی دعوت دی۔ حفصہ نے اپنی پیالی میں تھوڑا سا فالودہ ڈالا...... پہلے چمچ پر ہی طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی...... بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

''اتنے مزے کا فالودہ کہاں سے منگوایا؟''

''ارے تمھیں پسند آیا۔'' انھوں نے خوش ہو کر پوچھا اور کہا ''یہیں قریب ہی ہے ماسٹر ذوالفقار فالودہ والے...... بہت عمدہ فالودہ ہوتا ہے......'' دادی بی تو اپنی سہیلی کے ساتھ باتوں میں مگن رہیں اور ان کی پوتیوں نے حفصہ کو نرغے میں لے لیا...... اپنے ٹرنک سے کپڑے کی گڑیا، اس کے چھوٹے چھوٹے کپڑے، کھلونے سب کچھ نکال کے اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ دوسری بہن لطیفوں اور کہانیوں کی کتابیں لے آئی۔ یہ دیکھو کتنے اچھے ناول ہیں...... بے شک اپنے ساتھ گھر لے جانا۔ ایسی مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں کہ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ حفصہ کو ان چھوٹی اور معصوم بچیوں سے مل کر کھیل کر بہت مزہ آ رہا تھا...... ایک دم قریبی مسجد میں اذان کی آواز آئی۔ اذان کی آواز سنتے ہی حفصہ چونکی اور تو اور دادی بی بھی ہڑبڑا کر اٹھیں۔

''ارے مغرب کی اذان ہوگئی...... اتنی دیر گزرتے پتہ ہی نہ چلا۔'' ایک دم وہ چادر لینے کے لیے اٹھیں تو ان کی دوست صغیرہ بانو کھلکھلا کر

ہنسیں۔

''ارے بھئی کوئی جانے دے گا تو جاؤ گی ناں......!!رات کے وقت کا کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔''

''اے لو رات کے کھانے کی کہاں گنجائش۔'' دادی بی نے کہا۔

''گنجائش تو نکالنا پڑے گی زہرہ بیگم، ہاتھ کھلا نہ سہی دل تو کھلا ہے...... جو دال دلیہ پکا ہے وہی کھلائیں گے......اے شنو، ناہید کہاں ہو جلدی کرو ناں یہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار بیٹھی ہیں۔''

لو جی حفصہ نے دیکھا اسی چار فٹ کے برآمدے میں دسترخوان بچھایا گیا اور منٹوں سیکنڈوں میں کھانا بھی لگ گیا......حفصہ آئی دسترخوان کی طرف دیکھا اور منہ میں پانی بھر گیا۔

دال، چاول......ام......ام......آم کا اچار، رائتہ، سلاد، گرما گرم پھلکوں کے ساتھ کریلے گوشت کا سالن......

نہ نہ کرتے بھی دادی بی کو انھوں نے خوب کھلا کر ہی دم لیا، رہی حفصہ تو دال چاول اچار کے ساتھ ویسے ہی بڑے شوق سے کھاتی تھی...... میٹھے میں خربوزے تھے، ٹھنڈے ٹھنڈے......خوب مزہ آیا کھانے کا......نماز کے بعد دروازے پر پھٹ پھٹ کی آواز آئی......''ارے یہ ایف سکسٹین کا ابا، اتنی جلدی آ پہنچا......اتنی جلدی تھوڑا ہی کہا تھا......''صغیرہ بانو بولیں۔

حفصہ کو ہونق بنا دیکھ کر خود ہی سمجھانے لگیں''ارے یہ ہمارے پڑوسیوں کا رکشہ ہے جسے سب بچوں نے ایف سکسٹین کا نام دیا ہوا ہے۔ میں نے ہی پیغام بھجوایا تھا کہ سواری لے کر جانا ہے دس بیس منٹ کے بعد آنا......خیر آ گیا ہے تو کوئی بات نہیں......''

ان کی بڑی پوتی حفصہ کے ہاتھوں پر خوب ڈیزائنوں والی مہندی لگانے میں مصروف تھی۔ مہندی مکمل ہوئی تو سب نے حفصہ کو دوبارہ آنے کی دعوت دی، خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا......اور زورزبردستی سے اس کے ہاتھ میں پچاس روپے تھما دیے۔

''نہیں میں نہیں لوں گی'' حفصہ نے پیسے واپس کرنا چاہے۔

''ارے پہلی دفعہ آئی ہو......اگلی دفعہ نہیں دوں گی......''صغیرہ بانو نے ہنس کر کہا۔ دادی بی کا اشارہ پا کر حفصہ نے پیسے رکھ لیے۔ جب وہ دونوں دادی پوتی رکشے میں سوار ہوئیں تو اندر سے بچی نے ایک ٹفن حفصہ کو پکڑایا۔

''نانی نے کہا یہ فالودہ ہے تمھیں بہت پسند ہے ناں۔'' رکشہ سٹارٹ ہوا۔ پورا خاندان گلی مڑنے تک ہاتھ ہلا ہلا کر انھیں الوداع کہتا رہا......

حفصہ نے سوچا......دونوں ہاتھوں پر مہندی، نئی نویلی چوڑیاں، مزے مزے کے کھانے، پچاس روپے اور منوں ٹنوں کے حساب سے خلوص چاہت......!!

پتہ نہیں یہ لوگ، دولت مند ہونے کے بعد انھی اقدار کے ساتھ ملیں گے یا......طوبیٰ کے اہل خانہ کی طرح......؟ بہرحال طوبیٰ کے ہاں جا کر جن خیالات کو دھچکا لگا تھا دادی بی کی دوست کے ہاں آ کر نئے خیالات کو دل میں جگہ دینا پڑی......اور دادی بی اسے متوجہ کر کے پوچھ رہی تھیں۔ کیسا لگا آج کا یہ تجربہ!!

☆......☆......☆

درِ دل لا دوا

آیا۔ ابو نے مجھ سے پوچھا تو میں نے ہاں کر دی۔ میرا خیال تھا کہ شادی ہو جائے گی میں اس ملک سے چلی جاؤں گی۔ حالات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔

ابو کی ڈیتھ ہو گئی......وہ میرے احساسات کو سمجھنے والے، میری بات ماننے والے، میرا واحد سہارا تھے۔ مجھے لگا میرے سر سے دوپٹہ ہٹ گیا ہے۔

بہر حال بھائیوں نے شادی کر دی، میں یہاں آ گئی۔ اب وہاں خاموشی ہے وہ سب مجھے یوں بھول گئے جیسے میں کبھی اس خاندان کا حصہ ہی نہ تھی۔ وہ یاد آتے ہیں۔ فون پہ بات ہو جاتی ہے لیکن وہ مجھ سے لاتعلق ہیں۔ دس سال ہو گئے، کوئی مجھے ملنے نہیں آیا۔ نہ میری امی کسی بچے کی پیدائش پر آئیں۔ میں نے رو رو کے امی سے فریاد کی لیکن دس سال میں میرا اپنا کوئی بھی مجھ سے ملنے نہیں آیا۔"

"عقیل نے شادی کر لی......؟" اس کا اگلا سوال تھا۔

"ہاں کر لی ہے ناروے میں ہے اس کے چار بچے ہیں"۔

"کیا صرف یہی دُکھ ہے؟"

"نہیں یہ دکھ تو پرانا ہو گیا ہے، سہ لیا۔ کبھی کبھی شدت سے امی کی یاد آتی ہے کہ وہ مجھے گلے لگائیں لیکن...... یہ قیدِ تنہائی بلکہ قیدِ رُسوائی تو اب اپنا مقدر ہے"۔

"اللہ نہ کرے رُسوائی کیوں؟"

"میرے میاں کو مجھ سے ایک سو ایک شکایتیں ہیں، میں ان کو دُور نہیں کر سکتی"۔

"مثلاً......؟" زینب نے پوچھا۔

"میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں یہاں آ کر میں نے ایم بی اے بھی کر لیا تھا لیکن میں ملازمت نہیں کرتی کیونکہ چھوٹے بچوں کے ساتھ سارا دن مصروف رہتی ہوں۔ ناشتہ کراؤ، پھر لنچ بکس بناؤ، بچوں کو چھوڑ کے آؤ، واپسی پر شاپنگ کرو، دوپہر کا لنچ تیار کرو۔ واشنگ مشین چلاؤ، کپڑے پھیلاؤ، گھر صاف کرو، بستروں کی چادریں بدلو، ویکیوم چلاؤ، گھاس کاٹو، گارڈن میں پانی دو۔ ہر ہفتے آٹھ دس خاندانوں کی دعوت ہوتی ہے۔ میں روز ایک کھانا بنا کر فریزر میں رکھ دیتی ہوں کیونکہ ایک دن بیس پچیس بندوں کا کھانا پکانا مشکل ہو جاتا ہے۔ برتنوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ اس پر فرمائش ہوتی ہے کہ گرم روٹی توے سے اُترے تو مجھے کھانے کو ملے۔ میں کھانا لگا کر بچوں کو باپ کے ساتھ بٹھا کر توے پر پھلکا ڈالتی ہوں۔ اگر ذرا بھاری ہو تو واپس کہ مجھے روٹی نہیں کھانی مجھے پھلکا چاہیے۔

ذرا سا دھیان کہیں اور چلا گیا تو روٹی خراب ہو گئی۔ اب سارا دن بے عزتی پروگرام چلتا رہے گا۔ بچہ اچھی چیز سیکھے اور بولے یا کرے تو باپ کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ اگر بدتمیزی کرے، کپڑے گندے کر دے، آئس کریم کپڑوں پر گرا دے، کہنا نہ مانے، لوگوں کے گھر جا کر رو

پڑے تو سننے کو ملتا ہے بیوقوف عورت، موٹی، کم عقل، فارغ...... یہ بچوں کی تربیت کی ہے۔

میں نے چار سال جاب کی بھی ہے۔ میری تنخواہ میرے شوہر سے زیادہ تھی لیکن فائدہ، ساری تنخواہ ہمارے جائنٹ اکاؤنٹ میں جاتی ہے۔ میرے ہاتھ میں تو ایک پیسہ نہیں آتا۔ جو بچوں کا وظیفہ ملتا ہے وہ بھی ان کی جیب میں۔ میرا تو کوئی خرچ نہیں ہے۔ کپڑے ان کی پسند کے، جوتے ان کی پسند کے، بچوں کے ہیئر کٹ ان کی پسند کے، ہر وقت خرچ کی تنگی کا رونا اور ہر ماہ دو سو ڈالر دعوت پر اُڑا دینا۔ بولے کون!

اب شادی ہے میرے دیور کی۔ پاکستان جانا ہے۔ سسرال کا رویہ اس سے بھی بدتر ہے۔ اب وہاں جا کر تین ماہ رہنا ہے۔ یہ بچہ چھوٹا ہوگا۔ پاکستان میں سردیاں ہوں گی۔ میرے اپنے تو نا جانے اب بھی گلے لگائیں گے یا نہیں۔

کبھی کبھی ہوسٹل کا وہ کمرہ جہاں میں نے چار سال گزارے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن میری ساس کہتی ہیں آوارگی کے بہانے ہیں۔ پڑھ لیا، اب کیا کالج جانا۔

خیالات میں تضاد، پڑھے لکھے جاہل۔ سارا دن ایک پل کے لیے بستر سے کمر نہ لگاؤ۔ کام کرتے کرتے بے حال ہو جاؤ۔ اس انتظار میں کہ شام کو ایک شخص آ کر بے عزتی پروگرام شروع کر دے۔

بچوں کے سامنے ایسے الفاظ..... کل کو یہ بچے میری عزت کریں گے؟ کیا سیکھیں گے؟"

"کبھی علیحدگی کے بارے میں سوچا؟" زینب جو بت بنی اس کی داستان سن رہی تھی۔

"کدھر جاؤں گی؟" بچے چھین لیں گے۔ پہلے خاندان چھن گیا۔ اب یہ بھی چھن جائیں گے۔ پھر پناہ کون دے گا؟"

"ایسا کیوں سوچتی ہو۔ اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی مشکل سے زیادہ بوجھ کبھی نہیں ڈالنے والا، وہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے۔ فیملی کونسلر کے پاس جاؤ میں تمہیں نمبر معلوم کر کے بتاؤں گی۔ وہ دونوں میاں بیوی کو بلائیں گے اور جو بھی مسئلہ ہے اس کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر نہ ہوا تو گھر، بچے، خرچہ تمھارا...... اور شوہر کو اس کے گھر سے جانا ہوگا۔ یہ آسٹریلیا کا قانون ہے۔ یہاں عورت کو بہت تحفظ ملتا ہے۔ یہ پاکستان نہیں ہے جو تم چپ چاپ ظلم سہتی رہو۔ قانون موجود ہے تمھیں خود ظلم سہنے کا شوق ہے تو قانون کیا کرے۔

وہ پولیس کی اجازت کے بغیر تمھارے گھر میں داخل نہیں ہو سکے گا، سارا بے عزتی پروگرام بھول جائے گا۔ ظالم کے سامنے کلمۂ حق کہنا جہاد ہے۔ یہ لو میرا نمبر اور اپنا مجھے دو۔ میں رابطہ رکھوں گی۔"

اتنے میں الٹرساؤنڈ کی کال آ گئی۔

"دیکھو زینب ناراض نہ ہونا۔ پہلے میں نے تنگ آ کر ایک فیصلہ کیا تو کیا انجام ہوا۔ میرے سارے اپنوں نے مجھے چھوڑ دیا، منہ موڑ لیا۔ اب جیسا بھی ہے تین بچے اور شوہر ایک چھت...... گھر اور خاندان تو ہے۔ اس کو چھوڑ کے دوبارہ بے گھر، بے در اور تنہا ہونے کی سکت اور ہمت مجھ میں نہیں ہے۔ بچے رُل جائیں گے، کون پالے گا ان کے گھر کا ماحول انتہائی جاہلانہ بلکہ احمقانہ ہے۔ بچے ہمیشہ باپ کے ہوتے ہیں۔ یہ بڑے ہو کر طارق بنیں گے۔ شاید میرے ساتھ رہیں تو کچھ اخلاق میں یا کردار میں فرق پڑ جائے ورنہ ہم دنیا کو کیا خوبصورتی عطا کر کے جائیں گے۔ نیک انسان، اچھے مسلمان، اخلاق و کردار، جن میں لالچ نہ ہو جو عزت کرنا اور کروانا جانتے ہوں۔"

"ہاں عزتِ نفس......"

اس نے بات کاٹ دی...... عزت نفس کی تو صبح شام مٹی پلید ہو جاتی ہے۔ مجھے ہر حال میں اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ یہ دنیا کیا ہے، یہاں جدھر جاؤں گی کوئی عقیل یا طارق راہ میں کھڑا ہوگا۔ زندگی ختم ہو جانے والی شے ہے۔ ہمیشہ کی زندگی آگے ملے گی۔ اگر صبر سے کام لوگی تو شاید وہاں کچھ

compensation ہو جائے‘‘۔ وہ چپ ہوئی تو زینب بولی۔

’’تم بہت گریٹ ہو، اِن حالات میں تمھارے قدم نہیں ڈگمگائے اور تم سیدھے راستے پر گامزن ہو۔ میں دعا کروں گی اللہ پاک طارق بھائی کا دل بدل دے۔ یہ نیا بچہ گھریلو حالات میں محبت کی قندیل بن کر آئے‘‘۔

’’بہت بہت شکریہ، بس دعا کرتی رہنا، دعاؤں سے بھی تقدیر بدل جاتی ہے‘‘۔

’’رابطہ رکھنا، پہلے کی طرح بھول نہ جانا‘‘۔

’’نہیں نہیں تسلی رکھو......ضرور فون کروں گی......خدا حافظ!‘‘ اور ان دونوں نے باہر نکلنے والے راستے کی طرف قدم بڑھا دیئے

☆☆☆

ڈاکٹر نزہت اکرام

میری لائبریری سے

ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی وفات سے کچھ روز قبل یہ تحریر ’’بتول‘‘ کے لیے بھجوائی تھی۔ایک عظیم ہستی پر لکھی گئی تحریروں پر ایک اور بڑی ہستی کے قلم سے تبصرہ شائع کرنا ہمارے لیے سعادت ہے۔(مدیرہ)

کتاب: بنت الاسلام

شائع کردہ: ادارہ بتول، لاہور

روزنامہ جسارت کی حمیرا قریشی نے ان کی رحلت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا کہ بے شمار کتابوں کی مصنفہ، زندگی بے بندگی کے نام سے عظیم سلسلۂ کتب کی خالق، صدارتی ایوارڈ یافتہ، تین حصوں پر مشتمل سیرت اسوۂ حسنہ کی مصنفہ اسم بامسمیٰ اور عالمہ باعمل تھیں۔محترمہ بنت الاسلام کی رحلت یقیناً عالمِ اسلام کے لیے ایک بڑے سانحہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

سلمیٰ یاسمین نجمی اس وقت کی مدیرہ ’’بتول‘‘ نے اداریہ میں اندوہ گیں جذبات کے تلاطم کے ساتھ ان کی عشقِ الٰہی کی سرشاری بیان کی اور ان کے اخلاقِ حمیدہ گنوائے۔

’’......وہ سچی عاشق تھیں ایک ایک لحہ انہوں نے اس عشق کی سرشاری میں گزارا۔اپنے آپ کو ہر آلائش سے پاک رکھا۔اپنے خوبصورت دل کو ہمیشہ چمکا کر رکھا۔اس آئینہ کی آب نہ مٹنے دی۔اپنے اندر جلتے چراغوں کو اپنے جگر کا خون دے کر روشن رکھا۔ان کا وقت، سوچ، دماغ، دل، روح، قلم سب ایک ہستی کے لیے وقف تھے۔دل کے ایوانوں میں ایک ہی صدا گونجتی تھی......‘‘

بنت الاسلام کے خاندان بھر نے ان کی ستائش بہت احترام اور خلوص سے کی۔سعیدہ احسن مرحومہ نے اپنی طویل یادداشت میں بچپن سے ان کی وفات تک اپنے جذبات ومحسوسات کا ذکر کرتے ہوئے انھیں مافوق الفطرت ہستی قرار دیا۔عفت قریشی نے ان کی زندگی کا خاکہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح وہ ان کے دکھ درد میں ساتھی رہیں، مشکل میں رہنمائی کی۔وہ اپنے بہن بھائیوں سے بے حد محبت رکھتی تھیں۔روزانہ ان کے صدقے دیتی رہتیں۔’’آپا جی تو ہر ایک کے لیے تن من دھن سے خدمت کرنے میں دل وجان سے مگن رہتی تھیں۔میں رفیق زندگی کی وفات کے بعد غم واندوہ میں ڈوبی رہتی۔انہوں نے مجھے لکھنے کی طرف مائل کیا۔زر سے ذات انہوں نے ہی لکھوایا اور نام بھی انہوں نے ہی تجویز کیا‘‘۔

ڈاکٹر سعدیٰ مقصود نے ان کی نماز کی پابندی، پردے کی پابندی، ان کی شرم وحیا، ان کی زندگی سے بے نیازی اور موت کا شوق انتظار، سنت نبویؐ کا لحاظ بڑی تفصیل سے بیان کیا اور آخرت کا سفر لحہ بھر میں طے کر جانے کا تذکرہ حیران کن تھا۔

ان کے رفیق حیات محمد حنیف صاحب نے بھی مرض الموت میں بنت الاسلام کے صبر وتحمل کا خصوصی ذکر کیا:’’انتہائی قسم کی جسمانی اذیت کے باوجود ہائے وائے کے کلمات کبھی ان کے منہ سے نہیں نکلے۔ذرا سا بھی افاقہ ہوتا تو وہ حسب معمول تحریر وتالیف میں منہمک ہوگئیں۔میری چشمِ تصور آج بھی انھیں اس کرسی پر جلوہ گر پاتی ہے جس پہ بیٹھ کر وہ لکھائی پڑھائی میں مصروف رہا کرتی تھیں۔وہ اتنی تکلیف میں اپنے کو بھی مشیت ایزدی کے خلاف احتجاج تصور کرتی تھیں۔میں یہ ضرور بتانا چاہوں گا کہ ان کا مزاج زہد وورع کی خشکی ہی سے عبارت نہ تھا بلکہ ایک روح پرور شگفتگی بھی اس میں

موجود تھی یہاں تک کہ لطیف قسم کا مزاح بھی اس میں شامل تھا۔

بنت الاسلام کی بیٹی سلوت ملک نے اپنے بچپن کی یادوں کو زندہ کرتے ہوئے مادرانہ شفقت ومحبت اور اپنی ضد اور ہٹ کی بھی تصویر کشی کی۔ اکلوتی بیٹی کی دلچسپیوں میں خود کو ہر طرح شامل رکھا۔ تعلیم وتربیت میں کتنی سعی کی، لکھنے پر کس طرح مائل کرنا چاہا، شادی کے بعد کیسے مشفقانہ اور پند ونصائح پر مشتمل خطوط لکھے، ایک ماں کی ممتا اور بیٹی کی چاہت کا والہانہ انداز ان کے مضمون میں ہر طرح موجود ہے۔

یہی والہانہ انداز فرات احسن کا بھی اپنی بی بی خالہ کے لیے ہے۔ نثر پارے میں بھی اور نظموں میں بھی اور تقدس کا یہ احساس کہ ننھی بٹیا کو بی بی خالہ ہی شہد چٹائیں جیسے چھبیس سال قبل انہوں نے مجھے دنیا کے ذائقوں سے آشنا کیا تھا''۔ فرات احسن نے ان کی کتب سے اخذ کردہ عبارات کے چوکھٹے جس طرح کتاب میں پیش کیے ہیں ان سے بھی محبت واحترام کی نشان دہی ہونے کے ساتھ کتب کی افادیت کا پتہ چلتا ہے۔

عارفہ سعید نے بنت الاسلام کے اخلاق وعادات اور خصوصیت سے ہمدردانہ رویوں کا احاطہ بڑے خلوص سے کیا۔

عائشہ وحید نے اظہار کیا: ''بڑی پھوپھو سے مجھے جن باتوں کی رہنمائی ملی ان میں سے ایک اہم بات یہ تھی کہ انسان کسی حال میں بھی مایوس نہ ہو، وہ کبھی خود مایوس ہوئی تھیں اور نہ کسی اور کو مایوس ہونے دیتی تھیں''۔

نوشین اصغر قریشی نے بنت الاسلام کی خوبیاں گنواتے ہوئے انھیں حقوق العباد کا عملی نمونہ قرار دیا۔ وردہ اقبال نے موصوفہ کی ان صفات کو دہرایا جو چھوٹے بڑے سب کی زبانوں پر تھیں اور ان کے درسِ قرآن وحدیث کی اہمیت کا احساس دلایا۔ ان کی دعاؤں کی قبولیت کی مثالیں پیش کرتے ہوئے اپنوں بیگانوں سے محبت کا ذکر کیا۔ اسی سلسلہ کو قانتہ امجد نے سرچشمۂ ہدایت کے عنوان سے تحریر کرتے ہوئے نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ ثمر احسن نے اپنے دل میں ان کی محبت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا: یہ محبت محض میری خالہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی شخصیت، کردار وسیرت کی وجہ سے ہے جس نے ان سے متعلق ہر شخص کو ان کا گرویدہ بنا رکھا تھا...... وہ ہر کام اللہ کی خوشنودی کے لیے کرتی تھیں۔ جب انھیں اسوۂ حسنہ پر ''سیرت ایوارڈ'' ملا تو بہت تاسف سے یہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے: ''میں نے یہ کتابیں دنیا کے ایوارڈ کے لیے تو نہیں لکھی تھیں''۔ پھر اُنہوں نے وہ سب روپے امّی کو دے دیے کہ کتابوں کے فنڈ میں ڈال دیں۔

سامیہ احسن نے محترمہ بنت الاسلام کے بہن بھائی اور بھانجی بھتیجیوں کے غم والم کے احساسات کا احاطہ کیا جب انہوں نے ان عظیم خاتون کی وفات کی خبر سنی۔ وہ لمحہ کس کس پر کیا قیامت لایا تھا......

فرزانہ چیمہ نے بنت الاسلام کی ساتھیوں سے ملاقات کر کے محترمہ کے بارے میں اہم سوالات کیے جو ظاہر ہے ان کی شخصیت کے مختلف پہلو روشن کر گئے۔

مولانا مودودی کی بیگم نے بڑے یقین واعتماد سے کہا: وہ تو ایسی نیک اور صالح روح تھی۔ میں نے اُسے ہر رنگ ہر لباس میں دیکھا یعنی بیٹی کے لباس میں، بیوی کے لباس میں، بہن کے لباس میں، پھر ماں کے لباس میں بھی دیکھا لیکن ہر لباس میں وہ بہترین تھی۔ وہ بڑی نیک روح تھی، جنتی روح تھی۔ اس دنیا میں شاید ہمیں اپنا نمونہ دکھانے آئی تھی...... تیرہ برس کی عمر سے وہ تہجد پڑھتی تھی، کوئی چالیس سال پہلے اسے حج کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ وہ بڑے ہی معتدل مزاج کی مالک تھی۔ خوشی اور غمی ہر حالت میں اس کا رویہ معتدل ہی رہا۔ اس کے والدین بھی بہت بااخلاق اور بہت اچھے ہمسائے تھے۔ ہمارے ساتھ ہمدردانہ پیش آتے رہے۔

اُم زبیر صاحبہ نے اپنے دیرینہ تعلقات اور حلقۂ ادب اسلامی کے قیام کی روئیداد اور پروگرام کی کارکردگی برسوں پر محیط بتائی۔ بنت الاسلام صاحبہ کی بطور لیکچرار طالبات پر اخلاقی اسلامی تربیت پر زور اور کامیاب نتائج کا ذکر کیا۔ مرحومہ نیرّ بانو صاحبہ نے ان کے انداز پذیرائی اور حسنِ اخلاق کو

سراہتے ہوئے کہا کہ بنت الاسلام کی شخصیت منفرد تھی اور منفرد رہے گی۔ اپنے تاثرات میں نیرّ بانو صاحبہ نے ابتدائی دور کی تبلیغی جدوجہد، تقاضائے وقت کے تحت ماہنامہ عفت کے اجرا کے لیے تگ ودو کا ذکر کیا۔ پھر بتول جاری کرنے میں ان کی مساعی پر روشنی ڈالی۔

مسز رضیہ خان نے دس سال تک مسز رفعت حنیف (بنت الاسلام) کی سربراہی میں لاہور کالج کے شعبۂ اسلامیات سے وابستہ رہ کر درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ ان کی اصلاحی مساعی اور فرض کی پابندی ضرورت مند طالبات کے لیے ہمدردانہ اقدامات پر اظہار کرتے ہوئے کہا: ''ان کے ساتھ گزرا ہوا وقت زندگی کا بیش قیمت حصہ لگتا ہے''۔

آسیہ راشد نے اپنے تاثرات میں کہا: ''تحریر اپنا اثر تب ہی دکھاتی ہے جب لکھنے والے کے ہاتھ اس کے وجود کی زبان لکھ رہے ہوں۔ ایسی بات کیسے نہ دل میں اُترے۔ وہ اسم بامسمّٰی تھیں بنت الاسلام یعنی اسلام کی بیٹی، انہوں نے اس نام کا حق ادا کر دیا''۔

رضیہ ترین خان نے انھیں ولی اللہ کہہ کر اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیا وہ مرحومہ کی شاگرد بھی رہیں اور ساڑھے نو سال ان کی سربراہی میں فرائضِ منصبی ادا کرتی رہیں۔

ڈاکٹر اُمِ کلثوم نے انھیں احسنِ تقویم اور شرف انسانیت کی حامل قرار دیتے ہوئے خاندان بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ اور پوری انسانیت کے لیے ربِ قدیر کا خصوصی عطیہ سمجھا۔

ثریا اسما صاحبہ مدیرہ بتول نے بنت الاسلام کی عادات واخلاق کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی بہت سی خوبیوں کا ذکر کیا، انھیں محبت کا زم زم کہا کہ بات کرنے والے کا ہاتھ تھام لیتیں اور جب تک دوسرا نہ چھڑواتا نہ چھوڑتیں (یہ بھی سنتِ رسول کا تتبع تھا)۔ قدرت نے انھیں زبردست فراستِ ایمانی، معاملہ فہمی اور بصیرت عطا کی تھی اور ذہن بڑا رسا۔ ان کی تحریریں ان کی بصیرت پر آگاہ ہیں۔

محترمہ کی چلبلی شاگرد بنت الہاشمی نے اپنے ذہنی انقلاب کی تفصیل بڑے والہانہ انداز میں تحریر کی۔ ان کی متعدد شاگرد بچیاں صحیح دین اختیار کر لیتی تھیں۔ ثمین ذکاء ان کی ایک سنجیدہ شاگرد نے تحریر کیا کہ آپا جی (بنت الاسلام) نے بتایا: ''جسم کے لیے خوراک کی ضرورت ہے اُس کے تمام اجزا اس مٹی سے پیدا ہوتے ہیں اور انسانی جسم بھی تو مٹی ہی کی قسم کے مرکبات سے تکمیل پذیر ہوا۔ مگر روح غیب کی چیز ہے اس لیے اس کی غذا کا انتظام بھی وہیں سے ہوا ہے۔ اس کے خالق نے پانچ وقت کی نماز مقرر کر دی۔ جس طرح جسم بغیر خوراک کے لاغر اور بے سکت ہو جاتا ہے اسی طرح روح بغیر اس خاص خوراک کے اپنی تقویت کھو بیٹھتی ہے اور انسان پر اس کے نفس کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اپنی معلّمہ آپا بنت الاسلام کا اسلوب ہی کچھ ایسا سادہ خلوص بھرا اور دل موہ لینے والا ہوتا تھا کہ فوراً ہی بات ذہن نشین ہو جاتی تھی۔

کتابیں طبع کرنے کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ مواد تو کافی عرصہ سے تیار تھا لیکن چھپنے کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ میری چھوٹی بہن زری پاکستان آئی ہوئی تھی۔ اس نے ایک دن کہا: آپا جی میں صدقۂ جاریہ میں کچھ رقم دینا چاہتی ہوں، کیا کروں کیسے کروں۔ اسی لمحے میرے ذہن میں آیا کہ کتابیں بہترین صدقہ جاریہ ہیں۔ میری بہن سعیدہ احسن نے بھی پہلے یہ تجویز پیش کی تھی اور باقی بہن بھائی بھی اس سے متفق ہوئے کہ جس کی جتنی استطاعت ہو اتنی مَد میں ڈالے۔ بس اس کے بعد اس پر عمل ہو گیا۔

تبلیغ دین اور اصلاح معاشرہ کی ایسی مثال کتنی برکتیں سمیٹ لاتی ہے۔ فرزانہ چیمہ نے مرحومہ کی بات دہرائی۔ ''بیٹی فرزانہ عمر کے اس دور میں آ کر جو بات میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی بڑی ہی محدود ہے۔ ہمیں ہر کام یہ سوچ کر کرنا چاہیے کہ آخرت میں اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا''۔

وہ بلاشبہ تا زیست مقدور بھر قرآن وسنت کے راستے پر گامزن رہیں۔ آخری دم تک علم وعمل کی روشنی بانٹتی رہی، جو مینارۂ نور تھیں شکل کے لحاظ

سے بھی اور عمل کے لحاظ سے بھی۔ جنھیں پہلی بار دیکھا تو قرآن ہاتھ میں تھا اور آخری بار دیکھا تو حالتِ نماز میں۔

بلقیس صوفی نے ''بنت الاسلام آپا'' کو ایک مقدس ہیولا قرار دے کر ان کی شب و روز کی مصروفیات اور دین کو دلوں میں اُتارنے کی لگن کا تفصیلی ذکر کیا کہ خواتین اور بچے خصوصیت سے ہی ان کے مخاطب تھے۔

ڈاکٹر فوزیہ ناہید نے معاشرتی زندگی کا عملی نمونہ کے عنوان سے اپنے طویل مضمون میں محترمہ کے مثبت خیالات اور رویوں کا ذکر کیا۔ ان کے تجربات و احساسات اور مشاہدات کو زیرِ قلم لائیں۔ ایک بیٹی، بیوی اور ماں کی حیثیت سے ایک داعی کی حیثیت سے۔ اللہ کی رضا کے لیے ہی کام کرنا اور خوش اسلوبی سے صبر و تحمل سے دانائی سے کرنا ضروری گردانا یہی بنت الاسلام کا مقصدِ اولیٰ تھا۔

خالدہ پتانی، ڈاکٹر صوفیہ رشید، طیبہ یاسمین، رشیدہ صدف، بشریٰ تسنیم نے اپنے جذباتِ عقیدت و احترام اپنے اپنے انداز سے پیش کیے۔

تاثرات میں واقف جے پوری، نجمہ ثاقب، آمنہ منظور نیز عائشہ رفعت، فیروزہ قریشی اور فرزانہ رباب نے ان کے علم اور علمی کاوشوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ان کی اخلاقی بلندی کو سراہا۔ ان کے طرزِ بیاں کی اثر پذیری کا اعتراف کرتے ہوئے فرزانہ رباب نے تحریر کیا: ''جب ان کی تحریر پڑھی تو اس میں بہت سے رنگ نظر آئے۔ عبرت، نصیحت، کہانی پن، تاریخ وغیرہ وغیرہ۔ ان کی تحریر روح پر اثر انداز ہوتی تھی، دل کو مضطرب کر دیتی تھی۔ آخرت کا خوف، جوابدہی کا احساس بے چینی بڑھا دیتا تھا۔ اس زندگی کی ناپائیداری مگر دار العمل ہونے کی فکر دامن گیر ہو جاتی تھی۔ وہ اس حقیقت کو پا گئی تھیں ع

کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

لیکن جو لوگ اس زندگی میں اپنے نفس کو اطاعت و بندگی کی لگام میں کس کر خدا سپردگی کے نشے سے سرشار ہو جاتے ہیں وہ زندگی کی بھول بھلیوں میں رفت و گزشت نہیں ہوتے۔ وہ کٹھن راہوں پر خود چل کر دوسروں کو بھی بے آرامی کا درس دے جاتے ہیں۔

آپا جی بنت الاسلام نے زبانی رو در رو گفتگو کے ذریعہ ہی نہیں خطوط سے بھی ادیب خواتین کی فنی رہنمائی کی اور بڑی دلجوئی سے ان کی ہمت بندھاتی رہیں۔ خطوط کے آئینے میں ان کی بصیرت اور دانائی کے ساتھ ہمدردی کے پہلو بھی نمایاں ہیں۔ ان کا تنقیدی انداز ایسا مشفقانہ تھا کہ قلمکار دل برداشتہ نہیں ہوتے تھے۔ خامی بتا بھی دینا اور ناخوش بھی نہ ہونے دینا بڑی دانائی تھی۔

زیب اسد نے ان کی کتابوں سے اخذ کردہ سنہری اصول نسلِ نو کے لیے ترتیب دیے۔ مریم خنساء نے ان کے ذوقِ مطالعہ کو زیرِ بحث لاتے ہوئے محترمہ کی تصانیف و تالیفات پر بھی روشنی ڈالی۔

فرات غضنفر نے مشہور شعرا کے کلام سے چیدہ چیدہ اشعار لے کر اُن سے بی بی خالہ کی شخصیت نکھار کے پیش کی۔ فرات کی اپنی دونوں نظمیں بے ساختہ جذبۂ دل کی کیفیات کی ترجمان ہیں اور ان کی محبت ہر ہر لفظ میں رچی بسی ہوئی ہے۔

منظوم نذرانے میں تین قادر الکلام شعرا نے اور تین ہی شاعرات نے عقیدت کا اظہار کیا۔ جس طرح نثر میں ادب پارے تحریر ہوئے اس طرح نظموں میں بے پایاں جذباتِ احترام کا اظہار والہانہ انداز میں کیا گیا۔ جدت طرازی اور تازہ کاری کو ملحوظ رکھتے ہوئے بنت الاسلام کے اوصاف اشعار میں سموئے گئے۔ روانی و تسلسل سے ان کی دنیا سے بے نیازی، خلقِ خدا سے محبت، راہِ شریعت پر چلتے رہنے کا تواتر، دین کی اشاعت کے لیے سعیٔ جمیل، حسنِ کردار کو نو اشعار میں بھی اثر انگیز طور پر پرو یا گیا اور پچیس اشعار میں بھی سمویا گیا۔ پانچ پانچ مصرعوں میں بھی ڈھالا گیا اور نثری نظم میں بھی اُجالا گیا۔ ان کی تصانیف کے نام بھی نظم میں لائے گئے۔

فکر و فن کے زیرِ عنوان سید اسعد گیلانی، اسرار احمد سہاروی، سید نظر زیدی، عطیہ اقبال زیدی، حسان جلالی، بیگم ظفر عباس نے مرحومہ کی کتابوں پر

تبصرہ کیا ہے۔ سید اسعد گیلانی محترمہ کے افسانے زیر بحث لائے ہیں۔

ان کے افسانوں کا مجموعہ ''وہ غم اور ہوتے ہیں'' ان کی نگارشات کا نمائندہ مجموعہ ہے۔ انہوں نے اصلاحِ معاشرہ کو موضوع بنایا ہے۔ معاشرے کی ناہمواریوں کی نشان دہی کی ہے۔ غلط رسوم و رواج کے بُرے نتائج دکھائے ہیں۔ اچھے اور مثالی کرداروں کو اُبھارا ہے اور ان کی مدد سے معاشرے کے عمل کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں کا ماحول معاشرتی دکھ درد اور مسلمانوں کی غربت، پریشانی، جہالت اور بدکرداری کی بنا پر مصائب و آلام کا ماحول ہے جسے انھوں نے اسلامی اقدار کی بحالی سے دُور کرنے کی راہ دکھائی ہے۔

اسرار احمد سہاروی نے بنت الاسلام کی طرز نگارش کو زیر قلم لاتے ہوئے اظہار کیا: مرحومہ کو خاکہ نگاری، تاریخ نویسی، سوانح نگاری اور انشائیہ نویسی پر پوری قدرت حاصل تھی۔ پھر بات کرنے کا ڈھنگ اتنا معصوم اور پُر خلوص ہے کہ ہر بات دل میں اُترتی چلی جاتی ہے اور یہ مرحومہ کی ایمان کی پختگی، اظہار کی سچائی، ہمدردی اور دلسوزی کا نتیجہ ہے جو ان کو خدا اور رسولؐ کی محبت اور آخرت پر ایمان کی بدولت حاصل ہوا...... باوجود سرطان جیسی جاں گداز بیماری کے لکھتی رہیں۔ اجتماعات میں شریک رہیں۔ بچوں اور بڑوں سے محبت کرتی رہیں۔ اپنے مہلک مرض کا خیال چھوڑ کر دوسروں کی تیمارداری کرتی رہیں۔ ایسے فرشتہ صفت انسان کب اور کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

اسرار احمد سہاوری صاحب نے محترمہ کی ناول نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ناولوں میں مقصدیت زندگی کی تصویر و تفسیر، پلاٹ میں ابتدا عروج، معاشرتی محرکات، کردار نگاری، جذبات نگاری، مشاہدہ فطرت اور طرز ابلاغ پر روشنی ڈالتے ہوئے بنت الاسلام صاحبہ کو کامیاب ناول نگار ثابت کیا ہے اور مختلف اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ان کے ناول ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی'' پر بحث کرتے ہوئے اس کی خوبیوں کو اُجاگر کیا۔

نظر زیدی نے بنت الاسلام کا ''بچوں کا ادب'' کے عنوان سے ان کی بچوں کے ادب سے متعلق تخلیقات کے بارے میں اخلاق سُدھارنے کی مساعی کا ذکر کیا کہ اللہ نے انھیں بچوں کے لیے لکھنے کا بھی بہت سلیقہ دیا تھا۔ ان کی کتابوں کی صرف زبان ہی آسان نہیں ہے بلکہ اسلوب اور موضوعات بھی بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق ہیں اور یہ جذبہ تو ایک ایک لفظ سے عیاں ہوتا ہے کہ اپنی قوم کے نونہالوں کو اعلیٰ اخلاقی صفات سے مزین کرنے کی تمنائی ہیں''۔

عطیہ اقبال زیدی نے مرحومہ کی مختصر پُر اثر کتب کے حوالے سے بات کی ہے جو سلسلہ اخلاق کے نام سے قلمبند ہوئی تھیں۔ مرحومہ نے اخلاقی پراگندگی اور معاشرے میں بُرائیوں کے فروغ کو نیست و نابود کرنے کی آرزو میں طبع کرائیں جو صبر، زبان کی حفاظت، انسان دوستی، ظلم کے اندھیرے، عدل و انصاف پر دلائل دے کر ماحول میں پاکیزگی کردار کی راہ ہموار کرنے کے لیے لکھی گئیں''۔

خوبصورت گیٹ اَپ کے ساتھ ۴۲۲ صفحات پر مشتمل کتاب ''بنت الاسلام'' جسے سلمیٰ یاسمین نجمی نے اپنے قلم کو آنسوؤں میں ڈبو کر مرتب کیا ہے گویا ع

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

یہ نہ صرف ان کی پُر خلوص محبت اور تڑپ کی عکاس ہے بلکہ مرحومہ کے تمام پیاروں، عزیزوں، ساتھیوں اور عقیدت مندوں کے سوزِ جدائی کی بھی مظہر ہے۔ حسنِ ترتیب سے مزین یہ کتاب بنت الاسلام کی زندگی کے تمام تر درخشاں پہلو مزید اُجاگر کر رہی ہے۔ مرحومہ کا قومی انحطاطِ اخلاق پر دُکھی دل تڑپ رہا تھا کہ کس طرح اس مدہوش قوم کو ہوش میں لایا جائے۔ انہوں نے قلم سے جہاد کیا۔ شب و روز تصنیف و تالیف میں سرگرم رہیں۔ اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ اسلامی تعلیمات کو عامۃ المسلمین تک پہنچانے میں صرف کرنا ایک جہاد ہی تو تھا۔ ان کو شعورِ عصرِ رواں پوری طرح تھا بلکہ وہ تو اس حال میں تھیں کہ

فردا مری آنکھوں میں ہے ماضی مرے دل میں
اس طور شناسائے جہانِ گزراں ہوں!

انہوں نے اپنی روشن آنکھوں کو وا کر کے عصرِ حاضر کی تمام تر خرابیوں اور ان کے نتائج کو دیکھا تھا۔ یہ بصیرت کی فراوانی ہی تھی کہ وہ معاشرے کی تطہیر دین سے آگہی اور اسلام کی بقا کے لیے جان توڑ کوششیں کرتی رہیں ؏

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

کے مصداق فکری تعمیر کو اپنے اُوپر مسلط کر کے کینسر کا روگ لگا بیٹھیں۔ حالانکہ انھوں نے ہمیشہ ہر امر میں مثبت پہلو پیش نظر رکھا، ہمیشہ پُر امید رہیں، دوسروں کو بھی یہی سبق پڑھایا کہ نیک نیتی سے مساعی جاری رکھو، استقامت کے ساتھ دعا بھی کرتی رہو، مایوسی کو قریب نہ پھٹکنے دو، اللہ کریم ضرور سنے گا''۔

ان کی ہزاروں شاگردیں ان سے متاثر ہیں۔ بہت سی طالبات نے دین کو دل سے اپنایا بھی ہے لیکن مجھے حیرت اور افسوس ہے کہ کسی نے ان کی روشن حیات پر پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ کیوں نہیں لکھا۔ ان کی کسی تصنیف پر تحقیقی مقالہ لکھ کر کسی مادرِ علمی سے سند کیوں نہ پائی۔ کیا صرف اس لیے کہ وہ بنت الاسلام تھیں۔ کیا صرف اس لیے کہ وہ ایک پردہ نشین خاتون تھیں، اسلام کی مایہ ناز بیٹی تھیں۔

پی ایچ ڈی کی ڈگری تو خواتین کے شعری مجموعے کی تحقیق پر بھی حاصل کی گئی کسی ایک کتاب پر بھی دے دی گئی، ان سے مسز رفعت حنیف کہیں زیادہ بلندی پر ہیں اور رہیں گی۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی کسی مادرِ علمی کے شعبۂ اسلامیات نے بھی اسے قابلِ اعتنا نہ سمجھا ـــــ کیوں؟

☆☆☆

میمونہ حمزہ

چند روز امارات میں!

ہماری ٹانگیں جواب دے گئیں، سانس پھولنے لگا، مگر برج خلیفہ اسی طرح غائب ہو گیا تھا، جیسے نظامِ خلافت!! ہم اس کی عظمتوں کے گیت گاتے، تھکے ماندے بوجھل قدموں سے واپس لوٹ آئے، اور جب ہم لفٹ سے کمرے کی جانب جا رہے تھے، ڈاکٹر صاحب مسکرائے، ’’پیٹ کافی ہلکا ہو گیا ہے، اب اچھی نیند آئے گی‘‘، وہ بوجھل قدموں سے بے خبر چہل قدمی کے فوائد محسوس کر رہے تھے، اور ہم انکے پیچھے بھاگتے ہوئے اب اپنا سانس درست کر رہے تھے، اور یہ گتھی سلجھانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے کہ آخر خواتین ہی کا سانس کیوں پھولتا ہے!!

اگلی دوپہر تک ہم کافی اکتاہٹ کا شکار ہو چکے تھے، کانفرنس ختم ہو چکی تھی، اور بے فائدہ کروٹیں بدلتے ہوئے ہم نے واپسی کا ارادہ باندھا، اگرچہ بکنگ اگلی صبح تک کی تھی مگر ریت سیمنٹ کی دیواریں بہن بھائیوں سے بڑھ کر نہیں ہو سکتیں، ہم نے محسن کو فون کیا، وہ ابھی آفس میں تھا، اسے تبدیلیِ پروگرام سے آگاہ کیا، وہ خوشی خوشی ہمیں لینے آ گیا، چیک آوٹ کروا کر واپسی کے لئے قدم بڑھائے تھے کہ کاونٹر پر موجود اہلکار نے شاید اخلاقاً ہی ہم سے ہمارے قیام کے بارے میں پوچھا، ڈاکٹر صاحب نے ’’منی بار‘‘ نہ کھولنے پر احتجاج ریکارڈ کروایا۔

پورٹر سامان ٹرالی میں رکھ چکا تھا، محسن نے گاڑی نکالی، اور اسکا رخ گھر کی جانب نہیں بلکہ ڈاون ٹاون ’’دبئی مال‘‘ کی جانب موڑ دیا، دبئی مال دنیا کا سب سے بڑا شاپنگ اینڈ انٹرٹینمنٹ سنٹر ہے، اسکا افتتاح نومبر ۲۰۰۸ء میں ہوا ہے، اس میں بارہ سو سے زیادہ دکانیں ہیں، محسن گفتگو میں مگن منزل کا نشان مس کر چکا تھا، اسے اندازہ ہوا، وہ آگے نکل آیا ہے، مگر کوئی بات نہیں، اسلام آباد کے راستوں کی مانند دبئی میں بھی آپ لاکھ بار بھول لیں کوئی نہ کوئی نسبتاً طویل راستہ نکل آتا ہے جو منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے، سو کچھ دیر بعد ہم دبئی مال میں داخل ہو رہے تھے، اسکے ساتھ ہی دنیا کا سب سے طویل القامت برج ’’برج خلیفہ‘‘ کھڑا تھا، یہ ۸۲۸ میٹر سے زیادہ بلند قامت ہے، اس میں ۱۶۰ منزلیں ہیں، جو دنیا کی کسی اور عمارت میں نہیں، اس میں دنیا کا سب سے لمبا ایلیویٹر بھی نصب ہے، اسکا ڈیزائن ایک صحرائی پھول کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے، عمارت کی مضبوطی اور منفعت دونوں کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے، اور موسمی اثرات، تیز ہواوٴں اور آندھیوں کے ٹیسٹ کے بعد ہی اسے منظور کیا گیا ہے، ہم نے موبائل کیمرے سے اسکی تصویر لینا چاہی، مگر مکمل برج کی تصویر نہ بن سکی، ہاں ٹکڑے کر کے تین قسطوں میں ہم نے اسے مکمل کر لیا، ہمارے ذہن میں ایک خیال کوندا، ’’ھل فی ذلک فلیتن المتنافسون‘‘ کیا مقابلے کا میدان بس یہی ہے، ایک بہت بڑی عمارت بنانے کے لئے تو فرعون نے بھی ھامان سے کہا تھا، مگر یہ برج کیسا تھا؟؟ اللہ کی نعمتوں پر شکر گزاری، یا اس کے انعامات پا کر بے خوف ہونے کی علامت!!

دبئی میں یہ ایک برج ہی نہ تھا، ۶۰، ۷۰ منزلہ عمارتیں کھمبیوں کی مانند اگی ہیں، ہر برج آسمان جیسی وسعتیں لئے ہوئے ہے، زمین کا نظارہ کریں تو سڑکوں کے کنارے بڑی محنت سے شجر کاری کی گئی ہے، خوش رنگ پھولوں کی کیاریاں بڑی نفاست سے اگائی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس خطے کو اپنے ان بندوں کے سپرد کیا ہے، جو دنیا کے باغ کی تعمیر کر رہے ہیں، بلکہ اسے دنیا کے مقابلے میں نمایاں پوزیشن پر لا کھڑا کیا ہے، دنیا بھر سے ماہرین اور اہلِ علم کے لئے اپنے دروازے کھول دیے ہیں، بلکہ دبئی ’’بزنس ٹرانزٹ‘‘ سے بڑھ کر ’’ٹریڈ گیٹ‘‘ بن چکا ہے۔ دبئی مال کی پارکنگ میں محسن نے بڑی احتیاط سے گاڑی پارک کی، ارد گرد کے مناظر ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی، وہ بتانے لگا کہ ایک مرتبہ میں یہاں آیا، تو گاڑی پارک کر کے اسکا مقام بھول گیا،

پھر تین ساڑھے تین گھنٹے گاڑی تلاش کرتا رہا مگر بے سود، آخر کار عملے کی مدد سے گاڑی تک پہنچا، جب پارکنگ کم وبیش ویران ہو چکی تھی، تب سے محسن نے جدید آلات سے لیس چابی بنوالی ہے، بلکہ اس پر گاڑی کا نمبر اور موبائل نمبر بھی لکھوالیا۔ ہم دبئی مال میں فرسٹ فلور پر پہنچے، ایک سے ایک دکان دعوتِ نظارہ دے رہی تھی، کچھ فاصلے پر ۱۵۵ ملین برس پرانا ''ڈائنا سار'' فوسل نصب تھا، باوردی اہلکار اسکے تعارفی لیف لیٹ بانٹ رہے تھے، اسے چند ماہ قبل ہی دبئی مال میں نصب کیا گیا ہے، اسکا نام تجویز کرنے کے لئے سرکاری طور پر ایک مقابلہ منعقد کیا گیا، اور یوں چوبیس میٹر لمبے اور سات میٹر اونچے ڈائنا سار کا نام سعودی عرب کی شہری ''جواہرا البیاض'' کی تجویز پر ''دبئی ڈائنو'' رکھا گیا، یہ نام ۶۰۰۰ ناموں کی فہرست میں سے چنا گیا، اور جواہرا کو اسکی بہن کے ہمراہ انعام کا مستحق قرار دیا گیا، ہم نے پوچھا کہ اس اتنے قدیم ڈائنا سار فوسل میں اصل ڈھانچا کتنے فیصد ہے، اہلکار کا جواب تھا، ۹۰ فیصد سے زائد، اور کچھ شکستہ حصوں کو مرمت بھی کیا گیا ہے۔

اسی مال میں دنیا کا سب سے بڑا ''انڈر واٹر زو'' بھی ہے، جو ۵۱ میٹر لمبا، بیس میٹر چوڑا اور ۱۱ میٹر اونچا ہے، اس میں دس ملین لیٹر ٹینک پانی ہے، اس میں ۳۳ ہزار سے زائد آبی جانور ہیں، جو ۸۵ اقسام کی نمائندگی کرتے ہیں، ان میں چار سو سے زائد چھوٹی بڑی شارک مچھلیاں اور ریز ہیں، اس میں سینڈ ٹائیگر شارک کی بڑی تعداد بھی ہے، کتنے ہی خشکی کے جانوروں کے مماثل مچھلیاں، جن میں زیبرا، زرافہ وغیرہ جیسی بھی تھیں، کچھ پتنگ کے مماثل بھی تھیں، جو تیرتیں تو ایسے لگتا جیسے پتنگ کو ''کنی'' دے کر ہوا میں چھوڑ دیا گیا ہو، اس ایکویریم کے درمیان میں ایک جنگلہ بھی لٹکتا دکھائی دیا، جس پر کئی اہلکار تھے، شاید وہ انہیں من پسند کھانا ڈالنے آئے تھے، اسی طرح غوطہ خور بھی یہاں وہاں تیرتے دکھائی دے رہے تھے، مگر انہیں دیکھنا مچھلیوں کے نظارے کی مانند حسین نہ تھا، ایکویریم کی مخلوقات کا کیا کہنا! یہ ایسا حسن تھا جو کیمرہ میں محفوظ بھی نہ ہو سکتا تھا، ہم نے جتنی بھی تصویریں بنائیں، وہ نیلگوں پس منظر میں ذرا بھی اچھی نہ لگیں، اتنی خوبصورت مچھلیاں بے رنگ ہو گئیں اور ان پر موجود اللہ کی کی خلاقی چھپ اور دب کر رہ گئی، سچ ہے آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، عکس بند ہوتا نہیں !!

نمازِ مغرب کی ادائیگی کے لئے ہم مسجد کی جانب بڑھے، ملحق واش روم انتہائی صاف ستھرے تھے، دو قسم کی ٹونٹیاں لگی تھیں، ایک کے نیچے ہاتھ رکھتے تو لیکویڈ صابن نکل آتا، اور دوسری سے صاف پانی، ہاتھ خشک کرنے کے لئے ٹیشو پیپر بھی رکھے تھے، اور برقی مشین بھی نصب تھی، مسجد کے دبیز قالین نمازنوں سے آباد تھے۔

بعد از نماز محسن دبئی مال سے باہر لے آیا، بولا برج خلیفہ کے سائے میں ''ڈانسنگ فاؤنٹین'' شو ہوگا، ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے، جو عورتوں کے رقص نہیں دیکھتے انہوں نے رنگ برنگ پانی کو قبضے میں لے کر اسے اس کام پر لگا دیا ہے، ہم مناسب بلند جگہ کھڑے ہو کر تماشے کا انتظار کرنے لگے، محسن کا موبائل انجانے نمبر سے بول اٹھا، معلوم ہوا کہ محسن گاڑی کی چابی مسجد ہی میں بھول آئے ہیں، ہمیں وہیں چھوڑ کر وہ چابی لینے بھاگے، محسن اپنے حسنِ انتظام پر اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا، کہ فون نمبر چابی کے ساتھ ہی لکھوالیا، ڈانسنگ فاؤنٹین کے باہر اژدہام بڑھ رہا تھا، کئی سیاحتی گروپ آ چکے تھے، جب ایک اہلکار کے اس اعلان نے رنگ میں بھنگ ڈال دی کہ آج کا شو کینسل ہو گیا ہے، یعنی ہمیں پانی کی اٹھکیلیاں دیکھنے سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔

ہم ہجوم کے پیچھے پلٹنے سے پہلے مال میں داخل ہو چکے تھے، محسن ہماری محرومی دور کرنے کے لئے ہمیں ''یوگرٹ لینڈ'' لے آیا، رات گئے واپسی کا سفر شروع ہوا، محسن تھکا ہوا تھا، مگر وہ باتیں کر کے وقت گزار رہا تھا، ٹریفک جام روزمرہ کا معمول بن چکا ہے، ۱۹۶۸ء میں یہاں صرف تیرہ گاڑیاں تھیں، اور آج شاید کم وبیش ہر گھر میں دو چار !! ٹریفک کا اژدہام اس ترقی کا منہ بولتا ثبوت ہے، محسن ہمیں مین روڈ کے بجائے ایک اندرونی سڑک پر لے آیا، یہ شارجہ پہنچنے کا شارٹ کٹ بھی ہے، راستے میں بلند و بالا عمارتوں کے ساتھ ساتھ زیرِ تعمیر عمارتوں کا جنگل بھی تھا، اس کی تعمیر و ترقی کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا بھر کی کرینز کا بیس فیصد صرف دبئی میں تعمیرات کے لئے استعمال ہو رہا ہے، دنیا کی سب سے اونچی عمارت، سب سے بڑا مال، سب

سے بڑا ہوٹل، اور دوسری بڑی بندرگاہ دبئی میں ہے، یہ دنیا کا سب سے تیزی سے تعمیر ہونے والا شہر ہے، دبئ مہمان نواز شہر ہے، جہاں انصار کی تعداد ۱۷ فیصد اور باہر سے آنے والوں کی ۸۳ فیصد ہے، دنیا کے ایسے شہروں میں عموماً بدامنی ہوتی ہے، اندر اور باہر والوں میں ایک کھنچاؤ کی کیفیت، مگر دبئی ایک پرامن شہر ہے، یہاں پر جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں، شاید اسکا سبب قانون کی پاسداری اور اسکی آہنی گرفت ہی ہو۔ دبئ ایک مختلف ساعلاقہ ہے، اور اسکا تعلق ان معدودے چند علاقوں سے ہے جو ٹیکس فری ہیں۔ دبئ سونے کے لحاظ سے بھی مشہور ہے، ۱۹۹۹ء میں یہاں دنیا کی سب سے بڑی سونے کی زنجیر بنائی گئی، جسکا وزن ۲۲ کلوگرام اور لمبائی ۴.۲ کلومیٹر تھی، بعد ازاں اسے کاٹ کر ۹۶۰۰ لوگوں کے لئے لاکٹ اور برسلیٹ بنائے گئے۔

ہم دوبئ کی کرامات میں کھوئے ہوئے تھے کہ شارجہ پہنچ گئے۔ سامان نکال کر اوپر پہنچے تو باجی اور بچے استقبال کو موجود تھے۔ بدن تھکاوٹ سے چور چور تھا، مگر باجی کا خیال تھا کہ دبئ نے ہمارے چہرے کی چمک بڑھا دی ہے، واہ رے دوبئ، تیری کرامتوں کا کیا کہنا!!!

(جاری ہے)

☆......☆......☆

حمیرا خالد

بے معنی تفکرات سے بچیے

تماشائی جو مصیبت میں مبتلا لوگوں کو دیکھ کر شکر کرتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ نہیں تھے۔حق کو حق مانتے ہوئے بھی ان کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ان کی غلطیوں کو تلاش کرتے ہیں تاکہ اپنے مرتے ہوئے ضمیر کو اور جلدی ختم کر سکیں۔باطل کی قوت سے خوف زدہ ہونے والے اپنے عوام کو بھی حق سے دور رہنے کی نصیحتیں کرتے ہیں۔سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنا کر پیش کرنے کے لئے تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ایسی تاویلیں جو الٹا ان کے خلاف پڑتی ہیں۔غیر جانبدار بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

اف! کیا کسی کے لئے غیر جانبدار رہنا ممکن ہے؟

نظریہ ایک نہ بھی ہو تو سب انسان تو ایک باپ کی اولاد ہیں۔اور پھر امت مسلمہ کا ہر فرد دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو ایک ابدی زنجیر سے جُڑا ہوا ہے۔مگر کیا امت مسلمہ کے افراد کے حاکم اندھے گونگے اور بہرے ہو گئے ہیں۔کیا ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے؟ کیا غیر جانبدار رہ کر زندہ رہا جا سکتا ہے؟ اپنے جسم کے کسی حصے میں تکلیف ہو تو کیا اس سے لاپرواہی کرنا اپنے جسم و جان کے ساتھ خیر خواہی ہے؟ حکومتوں کا تو کیا ذکر کریں۔عوام الناس کیوں تماشائی بن رہے ہیں۔جب غیر جانبدار جواب دہ ہوں گے تو کوئی حاکم ومحکوم نہیں ہوگا۔وہ غیر جانبدار جنہوں نے اپنی حکومت اپنی دنیا بچانے کے لئے اللہ کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے والوں کے لئے کوئی کلمہ خیر تک منہ سے نہ نکالا۔نیکی اور بدی کے درمیان کھلی کشمکش جاری ہو......اور نیکی کا پرچار کرنے والے چُپ سادھ لیں......کیا کبھی ایسا کسی عقل وشعور والے سے توقع کی جاسکتی ہے کہ اُس کا گھر اس کے لوگ آگ میں جلائے جا رہے ہوں اور وہ کہے کہ میں غیر جانبدار ہوں...... جب اپنے جیسے مصیبت میں ہوں اور غیر جانبداری کا رویہ ہو تو وہ مصیبت سیلاب کی مانند ان کو بھی بہالے جائے گی جو تماشا دیکھتے رہے۔

جی ہاں! دراصل تماشا دیکھنے والے حقیقی مجرم ہیں...... دنیا میں انسانوں پہ ظلم ہو رہا ہو تو اللہ تعالیٰ کو ہر گز پسند نہیں کہ کچھ لوگ تماشا دیکھتے رہیں۔اور اگر ظلم ان لوگوں پہ ہو جو ایمان والے ہیں......اور کچھ لوگ تماشا دیکھتے رہیں اور وہ بھی خود کو مومن ہی کہلانا پسند کرتے ہوں تو ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ رب کائنات غیر جانبدار نہیں ہے۔اگر وہ غیر جانبدار ہوتا تو پھر صرف جنت ہی سجاتا......مگر اُس عدل کرنے والے نے دوزخ بھی بنائی ہے۔

نیک و بد بھی اس لئے بنائے گئے کہ دونوں کی پہچان رہے اور دونوں کے پیروکار کسی ایک جانب ہونے کا ثبوت دیں اور عدل کی ترازو پہ تولے جائیں مگر وہ جو نیکی و بدی میں پہچان کے باوجود اپنا مقام متعین کر نہ سکے۔ان کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بدی پہ ڈٹ جانے والوں سے بھی زیادہ ہے۔

مارے گئے وہ جنہوں نے آگ کے گڑھے میں جلتے ہوئے مومنوں کا تماشا دیکھا۔ان ایمان لانے والوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کو دیکھ رہے تھے اور کوئی ردعمل نہ تھا۔غیر جانب دار تھے۔

ساری دنیا کے غیر جانب دار لوگو! اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچو اس کی پکڑ بہت شدید ہے۔اور اس دن کے عذاب سے ڈرو جب آگ ظالموں

کے جسموں کو جلائے گی اور ایک بار ہی جلنا کافی نہ ہو جائے گا۔ بدل دی جائے گی کھال، بار بار جلائی جائی گی اور یہ کامیاب مومن جنہوں نے ایک بار تمہاری جلائی آگ کی آزمائش برداشت کی اب تمہارے جلنے کا تماشا دیکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو سب ظالموں پہ...... وہ ظالم جو مومنوں پر ظلم ڈھائیں صرف اس پہ کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کے مالک کی بادشاہت و حکمرانی پہ ثابت قدم رہے۔

امت مسلمہ کا ہر فرد وہ عورت ہو یا مرد...... آج فیصلہ کرے کہ وہ کس کی جانب ہے؟ حق کی یا باطل کی؟ یا وہ غیر جانب دار ہے۔ حق کے لئے آواز بلند نہ کرنے والے بھی ظالم ہیں اس لئے کہ وہ ظلم وستم کے گواہ ہیں اور خاموش ہیں۔ اگر ہر مومن مرد اور مومن عورت نے اپنے اس ظلم (حق کی حمایت نہ کر کے) سے توبہ نہ کی اور حق کے لئے ممکن کوشش نہ کی اور غیر جانب داری کا ہی مظاہرہ کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہے۔

''جن لوگوں نے مومن مردوں، اور عورتوں پہ ظلم وستم توڑا اور پھر اس سے تائب نہ ہوئے یقیناً ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لئے جلائے جانے کی سزا ہے۔''

(سورۃ البروج۔10)

☆......☆......☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

سوچ لیں تماشا دیکھنے والے

نارِ نمرود ہو، مکہ کی گھاٹیاں ہوں، طائف کی وادی، کربلا ہو یا میدان رابعہ کا معرکہ......کامیاب وہ ہے جو اُس مالک کے معیار پر پورا اترے گا

اور جس کے آگے

صرف......خدا ملتا ہے!

بالکل یہی چوڑیاں اس نے لاہور میں کسی خاتون کے گھر قائم جیولری شاپ سے گراں ترین قیمت پر خریدی تھیں۔ دکان کی روشنیوں میں ان کی جھلملاہٹ نے ربیعہ کو مسحور کر دیا تھا۔ ''بہن یہ ایک ہی سیٹ ہے آج ہی آیا ہے ہینڈ میڈ ورک ہے سارا۔'' خاتون دکاندار جان چکی تھی کی گاہک کا دل اٹک چکا ہے۔ سو اس نے بھی ربیعہ کی طلب کو بڑھا ہی دیا۔ یہ اس کی ماں کا ہنر ہے، اس کا دل جیسے خوب تیز تیز دھڑکنے لگا۔ غیر اختیاری نگاہ سامنے کمرے میں ہر چیز اور منظر سے بے نیاز لیٹے باپ پر گئی جو ہمیشہ کی طرح ٹی وی میں ایسے گم تھے جیسے کوئی شراب کے نشہ میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز اوندھا پڑا ہو۔ ان دیکھے آنسو اس کے دل پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

''کیا میری ماں کی ساری زندگی ایسی ہی مشقتوں میں گزر جائے گی۔ خوشی کا درجوان کو ہرا ابھرا کر دے کبھی میری ماں کے لیے کھلے گا؟''

ماہ رخ کی زندگی اگر آرام دہ نہیں تھی تو کم از کم اس کی غیر شادی شدہ زندگی کے ماحول سے بہت بہتر تھی۔ دونوں میاں بیوی مل کر کماتے تھے اور ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے زندگی کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ چوڑیوں کو بیگ میں رکھنے کے لیے ربیعہ نے وہ الماری کھولی جہاں اس نے آکر اسے رکھا تھا۔ وہ لفافہ جو ماں نے عروہ کے لیے بھی نہ لیا تھا، اس نے احتیاط سے ماں کے کپڑوں تلے ہمیشہ کی طرح رکھ دیا کہ کبھی نہ کبھی ان کو مجبوری میں اس کی ضرورت پڑ ہی جائے گی۔ گو ہر بار اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی تھی کہ میکہ میں اس کے دیے تحائف ضرورت پوری کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ شوق پورا کرنے کے لیے استعمال میں آئیں۔

محفوظہ ابھی تک کمرے کو ترتیب دینے میں جتی تھی۔ ربیعہ نے ماں کو کندھوں سے تھام کر گلے لگا لیا۔ بنا کہے بنا سنے بہت کچھ دونوں نے ایک دوسرے کو منتقل کر دیا۔ کندھے پر تھامے بیگ کے اسٹریپ کو جماتی ربیعہ نے چادر کا پلو ماتھے تک کھینچا اور گھر سے باہر قدم بڑھا دیے۔

کل وہ لاہور جا رہی تھی یہ ماں سے روانگی سے قبل کی ملاقات تھی۔ دروازہ بند کرتے اسے اپنے عقب سے باپ کی ناگواری لیے آواز آئی کہ وہ آئے دن یہ سادہ پکے کھانے کھاتے تھک گئے ہیں۔

''زندگی بدنما لگتی ہے یہ سیدھے سادے شکل اور ذائقہ کے کھانے دیکھ کر بھی اور کھا کر بھی۔''

باپ کا یہ جملہ سنتے ہی اس کا دل چاہا کہ وہ پلٹ کر آئے مگر انتظار میں کھڑی گاڑی اور ڈرائیور اس کے باپ کا نہ تھا۔ اس کے شوہر کے باپ کا تھا۔ رشید بیگ کی کمائی اس گھر میں مدت ہوئی آنی بند ہو گئی تھی۔ اس کی ابتدا بچوں کے اسکول کی فیس سے رشید بیگ کی لاتعلقی سے جو ہونی شروع ہوئی تو وہ بتدریج بڑھتی ہی چلی گئی۔ اس پر یہ نخرہ دکھانا۔ ربیعہ کے دل میں باپ کے لیے مزید کدورت بڑھا گیا۔ حالانکہ ایسے فقرے اس کے اپنے سسرال کے مرد بھی بول جاتے تھے، مگر وہ ان پر جچتے تھے کیونکہ وہ کفیل تھے اور اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہے تھے۔ ان کے ناز نخرے اٹھانا کسی کو بھی گراں نہ گزرتا تھا۔ الٹا ہنس ہنس کر عزیزوں میں ذکر کیا جاتا ایسے جیسے یہ ان کے شایانِ شان باتیں ہوں۔ لیکن اپنے باپ کے منہ سے ایسی فرمائش

سن کر اس کے وجود میں اندر تک کڑواہٹ اتر گئی۔ ذرا سی گردن ترچھی کر کے اس نے ماں کے چہرے پر نظر ڈالنا چاہی، جہاں ہمیشہ کی طرح سکوت تھا لیکن اب سکوت میں ذہنی وقلبی تھکان کا جال واضح نظر آنے لگا تھا۔ بوجھل دل کے ساتھ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی گاڑی میں آن بیٹھی۔ ڈرائیور نے حیرت سے اسے دیکھا اور سرعت سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ''گھر کی طرف جانے سے پہلے قریبی بازار لے لو، کچھ تیار کھانے پینے کی چیزیں خریدنی ہیں۔'' اس نے اتنا غیر متوقع جملہ کہا کہ زبان پر آئے جملہ کو ڈرائیور نے فوراً ہی روک لیا۔ اس کے موبائل پر ربیعہ کے سسر کا فون آچکا تھا کہ جلد از جلد گھر پہنچے کیونکہ شہر کے حالات میں گڑبڑ کی اطلاع تھی۔

چند منٹ کی ڈرائیو کے بعد گاڑی مشہور باربی کیو ریسٹورنٹ پر رک چکی تھی۔ ربیعہ نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں پیک کروالیں اور گاڑی کو ایک بھرا پنے میکہ کی جانب موڑنے کو کہا۔

''مگر باجی ابو جی کو کون بولے گا کہ ہمیں کیوں دیر ہوئی، شہر میں ہنگامے شروع ہیں۔'' ڈرائیور خاصا پرانا تھا گھر اور مالک کے انداز سمجھتا بھی تھا اور ماننے میں خاصی مستعدی بھی دکھاتا تھا۔

ربیعہ نے ابرو چڑھا کر شیشے میں ابھرتے ڈرائیور کے عکس پر نگاہ ڈالی اور کچھ نہ بولی۔ فکرمندی اس کو گھیر چکی تھی۔ سسرال میں جواب دینے کے حوالے سے بھی اور شہر میں سفر کے خدشات پر بھی۔ لیکن نکلتے نکلتے ماں کے چہرے پر پھیلا سناٹا اس سے یہ سب کروا رہا تھا۔ بنا کچھ بولے اس نے دروازے سے ہی ان کو سارے پیکٹ تھمائے اور پھر پلٹ گئی۔ محفوظہ کی آنکھوں سے قطرے خاموشی سے لڑھکتے گئے، اور انہی قطروں کے صدقے ربیعہ کے کسی خدشے نے ناگوار گھڑی کا روپ نہیں دھارا اور وہ عزت وعافیت کے ساتھ اگلی صبح لاہور چلی گئی۔

ستمبر کہو یا ستم گر، محفوظہ کے یادداشت میں تو سال کے بارہ مہینے ہی اب ستم گر سے تھے۔ مزاج میں رچے صبر نے زندگی کی آزمائشیں زبان سے شکوہ وشکایت کے انبار گونہ لگائے لیکن اب اعصاب میں تھکن اتر کر وجود کو دیمک کی طرح خاموشی سے چاٹ رہی تھی۔ ستمبر کی ایک حبس زدہ شام کو جب وہ اپنی بنائی کاریگری کے آرڈرز سے حاصل شدہ رقم لے کر گھر پہنچی تو اس کے چہرے پر خاصی طمانیت تھی۔ معقول رقم تھی مہینہ کے کتنے ہی اخراجات ادا ہو سکتے تھے۔ گھر کے دروازے پر مقامی کوریئر سروس کے ملازم کو کھڑے دیکھ کر اسے اچنبھا ہوا، کچھ لمحہ توقف کے بعد جب دروازے سے وہ ہٹا تو وہ گھر میں داخل ہوگئی۔ حیرت کا ایک جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ رشید بیگ صاف ستھرے حلیہ میں خوشبو میں بسا کہیں جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ محفوظہ نے سوالیہ نظروں سے اسے اور اس کے ہاتھ میں دبے لفافہ کو دیکھا تو اس نے کسی بھی تاثر کا اظہار کیے بغیر محض اتنا کہا۔

''میرا انتظار نہ کرنا، کسی سے ملنا ہے دیر ہو جائے گی۔''

محفوظہ کے لیے یہ سب کچھ ناقابل یقین تھا۔ تنتیس سال کی شادی شدہ زندگی میں اس نے اپنے شوہر کو اس قدر خوش باش کبھی نہ دیکھا تھا، نہ آواز میں ایسا لوچ اور نہ آسودگی۔ گو یہ جملہ بھی کسی اپنائیت کا ساز لیے بنا تھا مگر ایک کھنک سی تھی، جس میں خاصی بے نیازی بھی تھی۔ ایسے فاتح کا سا لہجہ جسے جیتتے ہی انسانوں پر حکومت کا اختیار مل چکا ہو۔

''یہ لفافہ کیسا ہے؟'' محفوظہ نے اس منظر کی حیرت کو یکایک توڑتے ہوئے پوچھا تو قدم بڑھاتے رشید بیگ نے جو نظر ڈالی اس میں محفوظہ کو طنز کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

''یہ لفافے نہیں خزانے کی کنجیاں ہیں، خزانے کی کنجیاں!'' اس نے اپنا ہاتھ ذرا اونچا کر کے لہرایا تو کوریئر سروس کے ایک نہیں دو لفافے ہل رہے تھے۔'' ''ایک کل آیا تھا، ایک آج آیا ہے!!''

محفوظہ اور کچھ پوچھتی مگر رشید بیگ کے چہرے کے تاثرات میں اس قدر نخوت اس نے محسوس کی کہ وہ سر جھکا کر اس کے مخالف سمت میں قدم

بڑھا گئی۔ زبان درازی اس کی سرشت میں کبھی تھی ہی نہیں۔ حق اور ناحق دونوں صورتوں میں وہ رشید بیگ سے الجھتی ہی نہ تھی۔ اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ اسے شوہر کے اس رویہ کا صدمہ زیادہ ہے یا حیرت زیادہ۔ گھر کے کام کرتے اس کے مصروف ہاتھ وقفہ وقفہ سے رک جاتے اور چند لمحوں پیشتر رشید بیگ کے ساتھ کیے گئے مکالمے زندہ ہو جاتے۔

☆......☆......☆

منتخب کالم

مفتی محمد رفیع عثمانی

نجات کا ذریعہ، اجتماعی توبہ

ہم سے جو گناہ ہوئے ہیں ان پر اللہ سے معافی مانگیں، بندوں کے حقوق جو رہ گئے ہیں وہ ادا کریں، کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ وطن عزیز کے خراب حالات کو پھر سے بہتر کر دے

اللہ رب العالمین نے ہمیں ایک ایسا وطن عطا فرمایا ہے جس کی نظیر قدرتی وسائل سے اگر دیکھا جائے تو شاید پوری دنیا میں نہیں ملتی۔ اللہ رب العالمین نے یہ وطن ہمیں صرف ایک کلمہ کی بنیاد پر عطا کیا تھا، جب ہم نے یہ نعرے لگائے تھے کہ ''پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ'' اور اس کا نام بھی ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' ہے، اس کے وجود کا مقصد ہی اسلامی نظام کا قیام ہے لیکن پاکستان بننے کے بعد جن لوگوں نے پاکستان بنایا تھا وہ تو اللہ کو پیارے ہو گئے اور اس ملک پر وہ قابض ہو گئے جو شریک سفر نہ تھے۔ ہم نے اللہ رب العالمین کے ساتھ بدعہدی کی ہے۔ ہم نے پاکستان بناتے وقت یہ عہد کیا تھا کہ ہم یہاں اسلام کا نظام عدل وانصاف قائم کریں گے، یہاں اسلام کا منصفانہ معاشی نظام قائم کیا جائے گا، یہاں پاکستانی عوام کو دینی اور دنیوی نصاب کو اعلیٰ معیار پر پڑھا کر دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کے قدم بقدم بلکہ ان سے بھی آگے چلانے کی کوشش کریں گے اور بلاشبہ ہمارے پاس ان تمام چیزوں کی مکمل صلاحیتیں موجود ہیں لیکن ہم نے ان صلاحیتوں کو استعمال کیا نہ ان قدرتی وسائل کو۔ کیفیت یہ ہو گئی کہ ہمارے ہاں خرابی اوپر سے نیچے آئی ہے، نیچے سے اوپر نہیں گئی۔ حکومت پر ایسے لوگ قابض ہو گئے جن کو ملک سے کوئی ہمدردی نہیں تھی سوائے چند مستثنیات کے لیکن عام طور سے حکمرانوں اور بیوروکریسی کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ ان کو صرف اپنے مفادات سے غرض تھی، ان کے مفادات کے اثرات پورے ملک پر منفی پڑے۔ یہاں تعلیمی نظام پنپ نہیں سکا، ہماری یونیورسٹیاں عصری علوم کے ماہرین بھی تیار کرنے سے قاصر رہیں، ملک کے مدارس میں دینی علوم کو پنپنے کی سرکاری طور پر کوئی توجہ دی گئی اور نہ عصری علوم کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی اور جنھوں نے کسی طریقے سے کچھ کمال حاصل کر لیا تو ان کے ساتھ وہ حشر کیا گیا جو ہمارے محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان حالات میں کسی علم وفن اور ہنر کو پنپنے کا کوئی راستہ نہیں کیونکہ تعلیمی معیار ہی ختم ہے۔

جب عوام کو تعلیم ہی نہ ملے، اخلاق نہ ملے، ملک وقوم سے محبت کا سبق نہ ملے، نہ اسکولوں سے، نہ ہمارے میڈیا سے، نہ ہمارے گھروں سے اور حکمرانوں کے یہ کرتوت سامنے آئے کہ جس کے قبضے میں ملک کا جتنا بھی خزانہ آ گیا اس نے اسے بے دریغ لٹایا اور اپنے مفادات کو سامنے

رکھا۔ چند مستثنیات بہر حال یہاں بھی مجھے رکھنے چاہئیں۔ ان حالات میں تقریباً پوری قوم کا مزاج یہ بن گیا کہ (تقریباً کا لفظ میں احتیاطاً کہہ رہا ہوں کیونکہ الحمدللہ ہمارے معاشرے کے ہر طبقہ میں نیک لوگ بھی موجود ہیں) جس کو مل رہا ہے وہ کھا رہا ہے جس کو جو موقع ملک کو لوٹنے کا مل رہا ہے وہ اس کام پر لگا ہوا ہے۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ اس ملک کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟ تو میں یہی کہوں گا کہ ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ کرپشن ہے، یعنی حرام خوری، کام چوری۔ پولیس تنخواہیں لے رہی ہے، اپنی ڈیوٹی نہیں دے رہی، بلدیاتی ادارے اگر ٹیکس لے رہے ہیں اور ان کے ملازمین تنخواہیں وصول کر رہے ہیں تو ہماری گلیوں، نالیوں کی صفائی کریں، کوڑا کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں انھیں اٹھانے کا انتظام کریں، حفظانِ صحت کے انتظامات کریں اور بلدیاتی ضرورتیں فراہم کریں۔ بجلی، پانی، گیس وغیرہ کے جو معاملات ہیں ان کو نمٹائیں۔ اگر ہمارے تعلیمی اداروں میں کام چوری ختم ہو جائے تو بچوں کو تعلیم ملنے لگے لیکن آج کیفیت یہ ہے کہ سرکاری اداروں میں تعلیم کی صورتحال تقریباً تباہ حال ہے۔ کام چوری ہمارے تعلیمی اداروں میں ہو رہی ہے جس سے طلبہ کو تعلیم نہیں مل رہی۔ کام چوری ہسپتالوں میں ہو رہی ہے جس سے مریضوں کو علاج نہیں مل رہا، کام چوری پولیس میں ہو رہی ہے، جس سے عوام کو تحفظ نہیں مل رہا، کام چوری ہمارے بلدیاتی اداروں میں ہو رہی ہے۔ ملک کے ہر طبقے میں چاہے فوج میں ہوں، پولیس میں ہوں، عدلیہ میں ہوں یا انتظامیہ میں ہوں، صنعتکار ہوں یا زراعت پیشہ ہوں یا ملازمت پیشہ افراد ہوں، تاجروں میں ہوں، ان میں الحمدللہ نیک اور اللہ سے ڈرنے والے لوگ بھی موجود ہیں، پاکستان سے محبت کرنے والے، اسلام اور مسلمانوں کے لیے قربانی دینے والے موجود ہیں۔ میں ان سب سے درخواست کرتا ہوں کہ حکومت کو اپنے مطالبات منوانا تو تقریباً بے کار سا ہو گیا ہے۔ ایک تو اس حکومت کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ حکومت کو وہ کام کرنے کی توفیق دے جو ان کے فرائض منصبی میں شامل ہیں۔ پاکستان کے متمول حضرات کی خدمت میں میری یہ تجویز ہے کہ آپ میں سے جن کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا ہے وہ اپنے گرد و پیش میں غریبوں کا اور مسکینوں کا جائزہ لیں۔ آج مملکت خداداد میں مہنگائی عروج پر ہے یہاں کے بیشتر عوام کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں، بچوں کو بھوک سے تڑپتا دیکھ کر بے روزگار باپ خودکشیاں کر رہے ہیں۔ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں کہ ایسے گھرانے تو نہیں جو غریب اور سفید پوش ہوں، آپ ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام کر دیں تاکہ انھیں سہارا مل جائے۔ تاجر پیشہ حضرات، صنعت کار اور ایسے حضرات جن کے ماتحت مزدور کام کرتے ہیں، ان کے مطالبہ سے قبل ان کی تنخواہیں وقت پر دے دیا کریں اور ملک میں مہنگائی کی مناسبت سے ان کی تنخواہوں میں اضافہ بھی کریں۔

میری درخواست تاجروں اور صنعتکار بھائیوں سے یہ ہے کہ وہ اپنے ملازموں اور مزدوروں کی تنخواہوں میں اتنا اضافہ کریں کہ اس کمر توڑ مہنگائی میں ان کو سہارا مل جائے، سہولت سے دو وقت کی روٹی ان کو میسر آ جائے، بچوں کا علاج میسر آ جائے ان کی تعلیم کا امکان پیدا ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص اپنے گھر میں اگر کوئی ملازم، چوکیدار، چپراسی رکھتا ہو تو وہ ان کے ساتھ حسب استطاعت خیر کا معاملہ کریں۔ اگر تنخواہوں سے ان کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تو زکوٰۃ سے ان کی ضرورتیں پوری کر کے اس معاشرے کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ اگر ہم ایثار اور قربانی سے کام لیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ انھیں غریبوں کی دعائیں ملیں گی، ان کے مالوں میں برکت ہوگی۔ ملازمت اور مزدور پیشہ حضرات سے میری درخواست ہے کہ وہ ملک و بیرونی ملک کارخانوں، ادروں اور محکموں میں ایمان داری کے ساتھ ڈیوٹی انجام دیں، کام چوری سے بچیں کیونکہ جو وقت آدمی چوری کر کے بچائے گا اور اس کی تنخواہ پوری لے گا تو چوری کے وقت کے مقابلے میں جتنے پیسے اس نے کمائے وہ ایسے ہی حرام ہے جیسے کہ سور کا گوشت حرام ہے۔

ہمارے ملک پر جو خطرات منڈلا رہے ہیں اور ہماری ناکام، احمقانہ اور بزدلانہ خارجہ پالیسی نے ہماری سرحدوں پر جو خطرات لا کھڑے کیے ہیں بلکہ ہمارے اندر خطرات کا جو زہر گھول دیا گیا ہے ان حالات میں عوام کیا کریں؟ اس سلسلے میں دو باتوں کی درخواست ہے۔

☆ایک یہ کہ نماز فجر میں دوسری رکعت کے رکوع سے کھڑے ہونے کے بعد قومہ کی حالت میں سنت کے مطابق قنوت نازلہ پڑھیں، قنوت نازلہ ایک عظیم الشان دعا ہے اور یہ ان حالات میں پڑھی جاتی ہے جب مسلمانوں کے لیے سخت پریشانی کا موقع ہو اور یہ احادیث سے ثابت ہے کہ مسلمانوں پر جب کوئی شدید حادثہ آتا تھا تو آنحضرت ﷺ نمازوں میں مسلمانوں کی حفاظت اور دشمنوں پر فتح کے لیے قنوت نازلہ پڑھا کرتے تھے۔ آپ بھی اپنے محلے کی مساجد میں قنوت نازلہ کے پڑھنے کا اہتمام کریں، کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں موجودہ ہر مصیبت سے نجات دے دے۔

☆ دوسرے یہ کہ ہر شخص چھوٹا بڑا، مرد وعورت چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے آیاتِ کریمہ لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین (الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے، بے شک میں ظالموں میں ہوگیا) کا ورد کسی خاص تعداد کے بغیر کرتا رہے۔ درحقیقت یہ دعا اپنے گناہوں پر ندامت کا اظہار ہے اور اللہ سے پناہ مانگنے کی دعا ہے۔

توبہ عظیم الشان چیز ہے۔ اللہ رب العالمین نے محض اپنے فضل وکرم سے ہماری کمزوریوں پر نظر فرما کر توبہ کے دروازے ہم پر ایسے چوپٹ کھول رکھے ہیں کہ انسان جہاں بھی ہے وہ اپنے سارے گناہوں سے توبہ کر سکتا ہے۔ توبہ کے لیے دو چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، ایک یہ کہ گناہ کے جو کام اس نے کیے ہیں ان کو گناہ سمجھ کر اللہ کے سامنے سچے دل سے شرمندہ رہے۔ دوسرے یہ کہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کرلے۔ وہ پکا ارادہ کرلے کہ آئندہ کوئی بھی گناہ نہیں کروں گا۔ ایسے موقع پر دل میں یہ بات آتی ہے کہ اگر میں نے توبہ کرلی اور اللہ سے وعدہ کرلیا اور عزم کرلیا کہ میں آئندہ گناہ نہیں کروں گا، پھر توبہ ٹوٹ گئی تو میں کیا کروں؟ تو شیطان دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ ابھی رہنے دو، بڑھاپے میں یا حج وغیرہ میں اکٹھی توبہ کرلینا۔ تو خوب سمجھ لیجیے! شیطان کے اس بہکاوے کا جواب حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے کہ توبہ اگر ٹوٹ جائے تو اس کو جوڑنا کوئی مشکل کام نہیں۔ جب بھی توبہ ٹوٹ جائے فوراً اس کو جوڑلو۔ خدانخواستہ وہی گناہ پھر ہوگیا، دوبارہ توبہ کرلو۔ پھر اللہ تعالیٰ قبول فرمالیتا ہے۔ توبہ کا دروازہ اس وقت بند ہوتا ہے جب آدمی کو موت کے فرشتے نظر آنے لگتے ہیں اور روح نکلنے کا وقت ہوتا ہے، اس سے پہلے پہلے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہوتا ہے۔ یہ تو رہا اللہ تعالیٰ کے حقوق کے معاملے میں کہ کسی نے خدانخواستہ شرب پی ہے یا کوئی گناہ وغیرہ کیا ہے تو وہ معاف کردے گا لیکن اگر مسلمان نے اپنے مسلمان بھائی یا کسی کافر کا حق مارا ہے، دھوکہ دے کر اس کا مال دبالیا ہے، اس کے پیسے لے لیے ہیں، اس کا دل دکھایا ہے، تھپڑ مار دیا، گالی دے دی، غیبت کردی، تہمت لگادی، اسے کسی بھی نوعیت کی تکلیف پہنچائی، یہ سب گناہ ہیں۔ بندوں کے حقوق میں توبہ کی قبولیت کے لیے یہ شرط ہے کہ اس شخص سے بھی معافی مانگے یا اپنی زیادتی کو اس شخص سے معاف کروالے، یا وہ اس کا حق ادا کردے، اگر وہ اس شخص کا حق ادا نہیں کرے گا اور وہ اُسے معاف نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس گناہ کی معافی کا وعدہ نہیں۔ خیال رہے کہ حقوق العباد کا معاملہ بڑا سنگین اور خطرناک ہے۔ لوگوں کی کثیر تعداد ماں باپ کو ستاتی ہے، بیوی بچوں کے حقوق ادا نہیں کرتی، بیوی پر تنگیاں اور سختیاں کرتی ہے، بہت سے لوگ عورتوں کو میراث نہیں دیتے، ہمارے ہاں یہ کثرت سے ہو رہا ہے، تاجر لوگ تجارت کے اندر دھوکہ اور ملاوٹ کرکے زیادہ پیسے کمانے کی کوشش کرتے ہیں، ذخیرہ اندوزی کرکے لوگوں کی زندگی اجیرن کردیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جو شخص لوگوں کی ضروریات کا سامان بازار میں فروخت کے لیے لاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو رزق دیتا ہے اور جو شخص ذخیرہ اندوزی کرتا ہے وہ ملعون ہے، اللہ کی طرف سے اس پر لعنت ہے۔'' گناہوں کو چھوڑنا اور بندوں کے جو حقوق مارے ہیں ان حقوق کی تلافی کرنا یہ بھی توبہ کا ایک حصہ ہے جس کے بغیر توبہ مکمل نہیں ہوتی۔

اللہ کے حقوق کے بارے میں ہم سے جو گناہ ہوئے ہیں ان پر اللہ سے معافی بھی مانگیں اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کرلیں اور دوسرے یہ کہ اللہ کے بندوں کے جو حقوق رہ گئے ہیں ان بندوں سے حقوق کی معافی مانگ لیں اور ان کے حقوق ادا کریں پھر کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ وطن عزیز کے خراب حالات کو بہتر کردے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے گناہوں سے توبہ کی توفیق دے، آمین۔ (روشنی)

☆......☆......☆